

حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

## کے مختصر حالات زندگی

☆ خاتم اسلام حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی .....! سرمایہ افتخار، محدث بے بدل، نقیبہ اور عظیم ترین محقق تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علم حدیث کی ترویج میں گزارا تھا۔ مختلف علمی موضوعات پر تحقیقی تصنیفات پر قلم کیں۔ سینہ میں ملت کا گہرا دور رکھتے تھے اور ہر ضرورت کے موقع پر ملک اور قوم کے لئے گراں بہا قربانیاں دیں۔ مسلک سے والہانہ لگن اور اہل سنت کے حقوق کی پامالی پر ہمیشہ مضطرب رہتے تھے۔

☆ حضرت کے تلامذہ کی بھی ایک طویل فہرست ہے جو ملک اور بیرون ملک میں دین کے متعدد شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ چشتی قادری نقشبندی اور سہروردی ان تمام سلسلوں میں اجازت بیعت حاصل تھی۔ مگر سلسلہ چشتیہ صامیہ میں بیعت کرتے تھے۔ تلامذہ کی طرح مریدین کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے اور پاکستان کے قریہ قریہ میں آپ کے ارادتمند پھیلے ہوئے ہیں۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب بے حد منکسر المزاج اور متواضع شخصیت کے مالک تھے۔ جس شخص کو بھی آپ کیساتھ کچھ روز گزارنے کا اتفاق ہوتا تھا، وہ آپ کے حسن اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ طبیعت میں سوز و گداز تھا۔ درس حدیث کی وقت اکثر آنکھیں ابھکا رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ مدرسہ سراج العلوم خانپور ضلع رحیم یار خان کے سالانہ جلسہ میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کے عنوان پر تقریر کر رہے تھے۔ عجب سماں تھا۔ پنڈال میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین بیٹھے ہوئے تھے اور سب کی آنکھوں سے سیل اشک جاری تھا۔ اس وقت آپ دوران تقریر بیچ پر سے گر پڑے۔ ہر شخص پر رقت کا عالم طاری تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی یاد میں لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نہ جھمتے تھے۔ بچکیوں میں ڈوبی ہوئی آوازیں۔ اشکوں کا سیل رواں اور پرسوز نالے۔ غرض تمام سامعین پر عجیب قسم کی از خود وارنگی طاری تھی۔

☆ غزالی دوراں ابوالنجم سید احمد سعید کاظمی کا سلسلہ نسب سیدنا امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک ہے۔ ۱۹۱۳ء میں آپ مراد آباد کے مضافاتی شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید محمد مختار کاظمی ہے۔ ایام طفولیت میں ہی والد محترم کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے برادر معظم اساتذہ العلماء حضرت علامہ سید محمد ظہیل صاحب کاظمی خاکی محدث امر دینی رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی ہوئی۔ حضرت سید محمد ظہیل کاظمی علیہ الرحمۃ انتہائی جید فاضل عظیم محدث اور صاحب نظر درویش تھے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور ہمیشہ حضور ﷺ کی محبت میں ڈوبی ہوئی نعین کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ ضلع بلند شہر شاہ جہاں پور اور امروہہ میں سالہا سال مدرسہ فرمائی۔ دورہ حدیث شریف ہمیشہ پڑھایا اور مختلف فنون کی بڑی کتابیں بھی پڑھاتے رہے۔ کیسا ہی مشکل سوال ہو، فی البدیہہ ایسا سلجھا ہوا فیض جواب ہوتا کہ زبان سے بے ساختہ ”سبحان اللہ“ نکلا اور دل مطمئن ہو کر مسرور ہو جائے۔ پاک وہند دیگر ممالک اسلامیہ میں آپ کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے ابتداء سے انتہا تک تمام تعلیم اپنے برادر معظم سے ہی حاصل کی اور آپ ہی کے دست حق پرست پر (سلسلہ چشتیہ صامیہ) میں بیعت ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں سند فراغت حاصل کی۔ دستار بندی کے موقع پر حضرت شاہ علی حسین صاحب اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے آپ کے سر پر دستار فضیلت باندھی۔ اس تقریب میں حضرت مولانا معوان صاحب رامپوری، حضرت صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، مولانا ثار احمد صاحب کانپوری و دیگر علماء کا برادر اعظم مشائخ اہلسنت موجود تھے جنہوں نے آپ کو خصوصی دعاؤں سے نوازا۔

## تدریسی زندگی

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب فراغت کے بعد بعض احباب سے ملاقات کے لئے لاہور تشریف لائے۔ یہاں حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ



علیہ کی زیارت سے مستفیض ہوئے اور حضرت مولانا سید ابوالبرکات اور مولانا سید ابوالحسنات سے ملاقات ہوئی۔ اسی اثنا میں ایک دن جامعہ نعمانیہ تشریف لے گئے۔ وہاں ایک کلاس میں حافظ محمد جمال صاحب کتاب ”مسلم الثبوت“ پڑھا رہے تھے۔ آپ سماع کی خاطر ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس وقت ماہیت مجردہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ نے بھی بحث میں حصہ لیا۔ آپ کی جودت طبع اور استحضار مسائل کے ملکہ سے حافظ محمد جمال صاحب بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے دیر انجمن خلیفہ تاج الدین صاحب سے آپ کی قابلیت کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے آپ کو جامعہ نعمانیہ میں تدریس کی پیش کش کی، جس کو آپ نے اپنے برادر معظم کی اجازت کی شرط پر منظور کر لیا۔

☆ جامعہ نعمانیہ میں تدریس کے دوران آپ کے ذمہ درس فطائی کی مشہور کتابوں (نور الانوار، قطبی، شرح جامی وغیرہ) کی تدریس مقرر کی گئی، جس سے طلبہ کامیابان آپ کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں اٹھائیس اسباق کی تدریس آپ کیساتھ متعلق ہو گئی۔

☆ ۱۹۳۱ء میں آپ لاہور سے واپس امر وہ تشریف لے گئے اور کچھ عرصہ تک امر وہہ کے مدرسہ یہ حنفیہ میں حضرت محدث محمد خلیل کاظمی کی سرپرستی میں تدریس فرماتے رہے۔ اس دوران ”مطلع العلوم“ کے حضرت مولانا خلیل اللہ سے مجلس ہوتی اور متعدد علمی مسائل مباحثے ہوتے۔ مشہور مناظر مولوی مرتضیٰ حسین در بھنگی سے بھی کئی بار مناظرے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ ہمیشہ کامیاب و کامران رہے۔

☆ لاہور کے زمانہ قیام میں حکیم جان عالم صاحب سے آپ کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے جو لاہور سے واپسی کے بعد بھی برقرار رہے اور ان سے خط و کتابت ہوتی رہی۔ انہیں کے اصرار پر آپ تقریباً آٹھائی سال کے لئے اوکاڑہ (ضلع ساہیوال) تشریف لے گئے۔ آپ نے یہاں مسلسل تبلیغ دین فرما کر بدعتیہ کی اور متقی رسالت کی وجہ سے کدو ہونے والی فضا کو صاف کیا۔

## ملتان میں آمد

☆ حضرت سید نفیر عالم ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ آپ کے برادر معظم نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ چنانچہ آپ نے حضرت سید نفیر عالم کو اپنا شیخ صحبت بنالیا۔

☆ حضرت قبلہ سید نفیر عالم ہر سال ملتان میں خواجہ غریب نواز سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجیری رحمۃ اللہ علیہ کا عرس منعقد کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں آپ کو وہاں تقریر کی دعوت دی۔ حضرت نفیر عالم نے جب آپ کی تقریر سنی تو دل و جان سے فدا ہو گئے اور تب سے ان کا پیغم اصرار رہا کہ آپ ملتان آ جائیں اور اہلایان ملتان کو مستفیض کریں۔ بالآخر ۱۹۳۵ء کے اوائل میں آپ ملتان تشریف لے آئے۔

☆ ملتان آنے کے بعد آپ نے اپنے رہائشی مکان میں ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ملاشیان حق اور تشنگان علم دور دور سے آ کر آپ کے چشمہ فیض سے میراب ہوتے رہے۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں آپ نے مسجد حافظ شیریں دیوانی روڈ پر آن مجید کا درس شروع کیا۔ بعض بد بختوں نے اس درس کو نا کام کرنا چاہا چنانچہ علاقہ کے تمام مخالف علماء درس میں شرکت کرتے اور دوران درس مختلف قسم کے اعتراض کیا کرتے تھے۔ مگر خدا کے فضل سے وہ ہمیشہ نا کام رہے۔ حضرت نے اٹھارہ سال کے طویل عرصہ کے بعد یہاں درس قرآن مکمل کیا۔ اسی اثنا میں آپ نے عشاء کے بعد حضرت چپ شاہ صاحب کی مسجد میں درس حدیث شروع کیا اور پہلے مشکوٰۃ اور اس کے بعد بخاری تشریف کا درس مکمل کیا۔

☆ آپ کے حلقہ درس میں یوں تو سب ہی آپ کے ارادت مند تھے لیکن حاجی محمد ابراہیم صاحب کہنی والے آپ سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ یہ کوثر انولہ کے ایک دیوبندی مولوی عبدالعزیز کے مرید و معتقد تھے۔ جب حاجی محمد ابراہیم نے حج پر جانکا ارادہ کیا تو مولوی عبدالعزیز کو جو انولہ سے انہیں رخصت کرنے کے لئے ملتان آئے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کا یہ مرید حضرت کا درس سنتا ہے تو بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے یہ لوگ تو (الویا ذالہ) مشرک ہیں۔ دوسرے دن جب حاجی محمد ابراہیم کو گاڑی پر سوار کرانے کیلئے انکے احباب گئے، ان میں حضرت کاظمی صاحب بھی تھے اور مولوی عبدالعزیز بھی۔ پھر وہاں کسی نے باہم تعارف کرا دیا۔

## مناظرہ و مباحلہ

☆ مولوی عبدالعزیز نے اس کے بعد اپنے تمام ہم خیال علماء کو اکٹھا کیا اور کہا کہ یہاں ایک بدعتی آ گیا ہے، اگر اس کے یہاں قدم جم گئے تو بڑی پریشانی ہوگی۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ حضرت ہم نے بارہا کوشش کی ہے لیکن ان کے علم اور ذوریوں کے آگے پیش نہیں جاتی۔ آپ کو فن مناظرہ میں بہت مہارت ہے اور علم و فضل



میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ ان سے مناظرہ کریں۔ چنانچہ مولوی عبدالعزیز اور اس کے حواریوں نے مناظرہ کی تیاری شروع کر دی اور کئی دن صرف کر کے بے شمار کتابوں پر نشان لگائے گئے۔ حضرت کا معمول تھا کہ روزانہ صبح درس کے بعد حضرت بہاؤ الحق رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضری دے کر آتے تھے۔ ایک دن وہاں سے واپس آ رہے تھے تو پیغام ملا کہ مولوی عبدالعزیز نے گھنگو کے لئے حاجی ابراہیم کی کمپنی میں بلایا ہے۔ حضرت کاظمی صاحب اسی وقت اور اسی حال میں کمپنی تشریف لے گئے۔ مولوی عبدالعزیز نے علم غیب کے مسئلہ پر گھنگو شروع کر دی۔ آپ نے حضور ﷺ کے علم غیب کے اثبات پر مندرجہ ذیل آیات پیش کیں

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ (ب ۲۹۔ سورۃ جن آیت ۳۶۔ ۳۷)

ترجمہ ☆ ”اللہ تعالیٰ غیب کو جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب کو کسی شخص پر ظاہر نہیں کرتا، سوائے ان کے جن سے وہ راضی ہو جائے جو اس کے رسول ہیں۔“

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيٰ مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ (ب ۴۔ سورۃ آل عمران آیت ۱۷۹)

ترجمہ ☆ ”اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ تم کو اپنے غیب مطلع کرے لیکن اللہ تعالیٰ (اطلاع علی الغیب کے لئے) جسے چاہتا ہے، پسند کر لیتا ہے جو اس کے رسول ہیں۔“

عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُنُمْ تَعْلَمُونَ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (ب ۵۔ سورۃ النساء آیت ۱۱۳)

ترجمہ ☆ ”اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں آپ کو بتلا دیں جو آپ نہ جانتے تھے اور یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے۔“

☆ ان تین آیتوں کے بعد آپ نے اثبات علم غیب کے لئے مندرجہ ذیل احادیث پر بھی

عن عمر قال قام فبينما رسول الله صلى الله عليه وسلم مقاما فاخبرنا عن بدء الخلق حتى دخل اهل الجنة منازلهم

واهل النار منازلهم حفظ ذلك من حفظه ونسبه من نسبه (بخاری) [كتاب بدء الخلق]

ترجمہ ☆ ”حضرت عمر سے روایت ہے کہ ایک دن حضور ﷺ نے ابتداء آفرینش عالم سے حوادث کی خبریں دینی شروع کیں۔ یہاں تک کہ جنتی جنت میں داخل ہو گئے اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو گئے۔ جس نے اس کو یاد رکھا، یاد رکھا اور جس نے بھلا دیا، بھلا دیا۔“

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فطمت ما في السموات والارض وفي رواية فتجلى كل شيء وعرفت۔

ترجمہ ☆ ”حضور ﷺ نے فرمایا میں نے جان لیا جو کچھ تمام آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔“ (مشکوٰۃ شریف باب المساجد)

☆ اور ایک روایت میں یوں ہے، ”میرے لئے ہر چیز منکشف ہو گئی اور میں نے اس کو جان لیا۔“ ان آیات اور احادیث کو سن کر مولوی عبدالعزیز کہنے لگا، ”فتاویٰ قاضی خان میں ہے، جو شخص حضور ﷺ کے لئے غیب کا مدعی ہو، وہ کافر ہے۔“

☆ آپ نے فرمایا، ”عجیب بات ہے، میں قرآن و حدیث پیش کرتا ہوں اور تم اس کے مقابلہ میں قاضی خان کے اقوال پیش کرتے ہو اور قول بھی وہ جو ”قَالَ“

کیا تھ مقرون ہے اور قاضی خان کی اصطلاح میں مقرر ہے کہ ”قَالَ“ کیسا تھ بقول ہو وہ ضعیف ہوتا ہے۔“

☆ مولوی عبدالعزیز نے کہا، ”تم حقی ہو۔“ فرمایا ”ہاں۔“ کہا، حقیوں کی کتاب شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے

”ان الانبياء لم يعلموا الغيبات من الاشياء الا ما اعلمهم الله تعالى احيانا۔“

ترجمہ ☆ ”انبیاء کو علم غیب نہیں ہوتا مگر ان باتوں کا جو اللہ تعالیٰ انہیں احيانا بتلا دیتا ہے۔“

☆ آپ نے فرمایا، یہ عبارت میرے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ اس عبارت میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے بغیر جاننے کی نفی ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے علم کا

قائل ہوں۔

☆ دوسرے یہ کہ اس عبارت میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو احيانا علم غیب عطا فرماتا ہے۔ اور احيان صین کی جمع ہے۔ اب میں بتلاتا ہوں کہ ایک

صین میں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کتنا علم عطا فرمایا ہے۔ ترمذی شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دست قدرت میرے شانوں کے درمیان رکھا۔ جس کی ٹھنڈک میں نے

اپنے سینہ میں محسوس کی۔ فعلمت ما في السموات وما في الارض۔ (پس میں نے جان لیا جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔)

☆ غور کرو جب ایک صین میں حضور ﷺ کے علم کا یہ عالم ہے تو احيان میں ان کے علم کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ مولوی عبدالعزیز نے کہا، ”دکھاؤ! یہ حدیث کہاں

ہے؟“ آپ نے ان ہی کی کتابوں میں سے یہ حدیث نکال کر پیش کی۔ کہنے لگا، ”مشکوٰۃ بے سند کتاب ہے۔ میں اس کو نہیں مانتا۔ ترمذی میں



دکھاؤ۔“ آپ نے بسم اللہ پڑھ کر ترمذی شریف کھولی تو سامنے ”سورہ ص“ کی تفسیر میں وہی حدیث نکل آئی۔ جب مولوی عبدالعزیز کو یہ حدیث دکھائی تو وہ غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا اور طیش میں آ کر کتاب کو پھینک دیا۔ جیسے ہی مولوی عبدالعزیز نے ترمذی شریف اٹھا کر پھینکی، حضرت کاظمی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا ”تو گستاخ اور بے ادب ہے۔ اب میں تجھ سے مناظرہ نہیں کرتا۔ مبالغہ کروں گا۔“ چنانچہ دونوں نے یہ الفاظ کہے۔ ”اگر میرا مقابل حق پر ہوا اور میں باطل پر ہوں تو میں ایک سال کے اندر خدا کے قہر و غضب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جاؤں اور اگر میں حق پر ہوں تو میرا مقابل خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے۔“ مبالغہ کرنے کے بعد آپ وہاں سے واپس تشریف لے آئے۔

☆ مولوی عبدالعزیز جب کوثر انوالہ پہنچا اور صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کا درس دینے کے لئے بیٹھا اور بولنا چاہا تو الفاظ منہ سے نہ نکلے، زبان باہر نکل آئی۔ کافی دنوں تک علاج کی کوشش کی گئی لیکن ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ کوئی مرض ہو تو اس کا علاج کیا جائے۔ یہ تو عذاب الہی ہے۔ بلا آخر سال پورا ہونے سے پہلے ہی وہ عذاب الہی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گیا۔

## قتلانہ حملہ

☆ مولوی عبدالعزیز کی شکست کے بعد حضرت کا عروج ظاہر ہوا اور ہر طرف سے لوگ آپ کو تبلیغ و ارشاد کے لئے بلانے لگے اور مسلک اہلسنت کی اشاعت ہونے لگی۔ اہلسنت کے اس غلبہ سے گھبرا کر مخالفین نے آپ کے قتل کی سازش تیار کی۔ چنانچہ مولوی حسین علی واں پھر دی کا شاگرد حبیب اللہ جو جتنی کوشش میں رہتا تھا، اس نے حضرت کو بہاولپور کے ایک گاؤں بلہ جھلن میں تقریر کی دعوت دی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ یہاں سے اوج شریف کا اسٹیشن بھی نو میل تھا اور تھانہ جتنی کوشش بھی نو میل تھا۔ ایسی دور دراز جگہ پر غنیمت محرم کو جمعہ کے دن حضرت کو تقریر کے لئے بلایا گیا۔ جلسہ میں کلہاڑی بردار لوگ کافی تعداد میں شریک تھے۔ اچانک مولوی حبیب اللہ تقریر کے دوران چلایا، ”قتل کرو۔“ چنانچہ کلہاڑی برداروں نے آپ پر حملہ کر دیا۔ جلسہ میں سنی لوگ بھی تھے۔ انہوں نے آپ کی طرف سے کافی مزاحمت کی لیکن حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے آپ کے سر پر کلہاڑی کے پیچم وار کئے اور شدید ضربات سے آپ بے ہوش ہو گئے۔ شوریج کیا کہ قتل ہو گیا ہے۔ تمام لوگ بھاگ گئے۔ ایک ہندو عورت آپ کو یہ کہہ کر اٹھا کر لے گئی کہ یہ سید کا بچہ ہے۔ تین دن تک آپ اس ہندو عورت کے گھر میں بے ہوش پڑے رہے۔ پھر ادھر ادھر لوگوں کو خبر ہوئی اور آپ کو ملتان لایا گیا، جہاں آپ چھ ماہ تک زیر علاج رہے۔ آپ کی عیادت کے لئے ہندوستان کے کونے کونے سے علماء و مشائخ تشریف لائے۔ ان بزرگوں میں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب، حضرت سید محمد ثکچو چھوی، حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی اور مولانا حشمت علی خان صاحب کے اسماء خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

## انوار العلوم کا قیام

☆ دوران علاج ہر وقت عیادت کرنے والوں کا جم گھٹا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اس جلسہ کا تو کوئی ایسا افسوس نہیں ہے لیکن یہ حسرت دل میں رہ گئی کہ زندگی میں کوئی عظیم کام سرانجام نہیں دیا۔ شیخ الاسلام شیخ مرچنٹ رحمۃ اللہ علیہ نے، جو اس وقت آپ کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے، یہ سننے ہی دس ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ ان کی بیگم نے اپنے سونے کے کڑے اتار کر دیئے کہ انہیں بیچ کر میری طرف سے نذر کر دیں۔ حضرت علامہ کاظمی صاحب کی اہلیہ نے بھی اپنا تمام زیور اتار کر نذر کر دیا۔ آپ نے اس رقم سے ملتان کے وسط میں زمین خرید کر جامعہ انوار العلوم قائم کر دیا۔

## تحریک پاکستان

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے برصغیر کے مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے قیام کے لئے بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مسلم لیگ کے بٹلجے سے قیام پاکستان کی توثیق کے لئے بنارس کانفرنس میں شرکت کی۔ جس زمانہ میں کانگریسی اور احراری علماء ہڑت کی بازی لگا کر پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، اس وقت حضرت علامہ کاظمی صاحب، حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی، پیر سید جماعت علی شاہ صاحب، مولانا ابوالحسنات، مولانا عبدالخالق بدایونی اور مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمہم اللہ تعالیٰ کی رفاقت میں الگ قومیت اور آزادی پاکستان کے لئے سعی مسلسل اور جہد پیہم کر رہے تھے۔

## جمعۃ العلماء پاکستان کی بنیاد



☆ قیام پاکستان کے بعد حضرت علامہ کاظمی صاحب نے نئے حالات کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ وہ لوگ جو کل تک پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، پاکستان بننے کے بعد انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور دیکھتے دیکھتے وہ حکومت کی نظر میں سرمہ چشم بن کر سا گئے۔ اس وقت آپ نے اہلسنت کے اتحاد اور تنظیم کی ضرورت محسوس کی تاکہ اہلسنت کو سیاسی استحکام اور قوت حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے آپ نے مولانا ابوالحسنات سے خط و کتابت کی اور ان پر تشکیل جمعیت کے لئے زور ڈالتے رہے۔ نیز آپ نے پاکستان کے تمام علماء کے نام خط لکھے۔ تا آنکہ مارچ ۱۹۴۸ء میں تمام علماء ملتان میں جمع ہوئے، جن میں حضرت مولانا صرطلالی (کراچی)، علامہ عبدالغفور ہزاروی (وزیر آباد)، مولانا ابوالنور محمد بشیر (سیالکوٹ)، مولانا ابوالحسنات (لاہور) اور مولانا غلام جہانیاں (ڈیرہ غازی خان) کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

☆ ملتان کے اجلاس میں اہلسنت کی تنظیم کا نام جمعیت العلماء پاکستان تجویز کیا گیا اور حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات کو جمعیت کا صدر اور حضرت علامہ کاظمی صاحب کو جمعیت کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

☆ حضرت علامہ کاظمی نے اپنی نظامت کے دوران جمعیت کو بے حد فروغ دیا اور جمعیت کے ذریعے ملک و ملت کی بیش از بیش خدمات انجام دیں۔ جہاد کشمیر، دستور سازی، تحریک تحفظ ختم نبوت، تبلیغ و اشاعت، سیلاب زدگان کی مدد، غرض ہر خدمت اور ضرورت کے موقع پر آپ نے جمعیت کے پرچم کو سر بلند رکھا۔

### اسلامی یونیورسٹی بھاولپور میں آپ کی خدمات

☆ محکمہ اوقاف نے علوم اسلامیہ کے تخصص اور تحقیق کے لئے بھاولپور میں جامعہ اسلامیہ کو قائم کیا۔ اس جامعہ کے شعبہ حدیث میں بلند پایہ محقق اور ماہر حدیث کی ضرورت تھی جو اس میں قوی دستگاہ رکھتا ہو۔ محکمہ اوقاف نے آپ سے شیخ الحدیث کا منصب قبول کرنے کی درخواست کی۔ اگرچہ انوار العلوم کو چھوڑنا آپ کے لئے بار خاطر تھا تاہم جامعہ اسلامیہ میں اہلسنت کی نمائندگی اور مسلک کے تحفظ کی خاطر آپ نے یہ عہدہ قبول کر لیا اور بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ فیصلہ بروقت اور صحیح تھا۔ آپ نے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۴ء تک جامعہ اسلامیہ میں شعبہ حدیث کے سربراہ کی حیثیت سے کام کیا۔

### تعلیمی نور کا ایک مناظرہ

☆ دوران تعلیم امر وہہ میں آریا سماج کا مشہور مناظرہ پنڈت رام چند آیا اور اس نے تنازع اور قدامت عالم پر مناظرہ شروع کیا۔ اس مناظرہ میں علماء اسلام نے شرکت کی اور مباحثہ میں حصہ لیا۔ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے بھی اپنے برادر معظم حضرت سید محمد ظہیر کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت اور حاضری کے ساتھ اس مباحثہ میں شرکت کی۔

☆ پنڈت رام چند نے قدم عالم اور تنازع پر قرآن کی دو آیتوں سے استدلال کیا اور کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ”كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ“ نیز فرماتا ہے، ”مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ“ (پ ۶۔ سورۃ النور آیت ۵۹)

☆ ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ بعض یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے بندہ کی جون میں اور بعض عیسائیوں کو خنزیر کی جون میں تبدیل کر دیا اور یہ یعنیہ تنازع ہے۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ مرنے کے بعد شہداء کی روحیں بنز پرندوں کی شکل میں اڑتی پھرتی ہیں اور یہ بھی تنازع ہے اور تنازع قدم عالم کو سترم ہے۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ تنازع اسے کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ایک جاندار کی روح دوسرے جسم میں منتقل ہو جائے اور یہاں یہودی اور عیسائی مرتد نہ تھے بلکہ زندگی میں ہی ان کی انسانی شکل کو منسوخ کر کے انہیں بندروں اور خنزیروں کی شکل میں متشکل کر دیا تھا۔ لہذا یہ تنازع نہیں تنازع ہے اور ارواح شہداء کی جو آپ نے حدیث پیش کی ہے، اس میں حضور ﷺ نے برزخ اور معاد کا حال بیان کیا ہے اور آپ معاد کے قائل نہیں ہیں۔ پنڈت رام نے کہا کہ اب تو میں جا رہا ہوں، آئندہ پھر بحث کروں گا۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، دیکھ موت کا کوئی پتہ نہیں ہے بلکہ اچھے یہ بتا کر جاؤ کہ اگر تم مر گئے تو آئندہ سال کس جانور کی جون میں آ کر مجھ سے ملاقات کرو گے۔ اس جواب پر وہ بہت خوش ہوا اور جاتے وقت آپ کو اپنی گھڑی انعام میں دے گیا۔

### مولانا محمد انریس کاندھلوی سے گفتگو

☆ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران مختلف حکاتب فکر کے علماء کراچی میں اکٹھے ہوئے۔ ایک مجلس میں مولانا ظفر احمد انصاری، مفتی محمد شفیع، مولانا محمد یوسف



نوری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور حضرت قبلہ کاظمی شاہ صاحب جمع ہوئے۔ انشاء اللہ گلو میں حضرت کاظمی صاحب نے مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے فرمایا، آپ نے اپنی کتاب ”الکلام“ میں مرزا غلام احمد قادیانی کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نبی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا نسب نسب اپنے زمانہ کے تمام احساب و انساب سے افضل ہو حالانکہ یہ بات بدلیل ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے کہا، میں نے حدیث شریف کا ترجمہ کیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے، ”کذلک تبعث الانبیاء فی احساب قومہم“ (انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کے بہترین نسب سے مبعوث کئے جاتے ہیں)۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، حدیث کا ترجمہ تو یہ ہے کہ جس قوم کی طرف نبی مبعوث ہو، اس کا نسب اس قوم میں افضل ہوتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے، نبی کا نسب اپنے زمانہ میں سب سے افضل ہوتا ہے۔ کہنے لگے، اگر میں نے یہ لکھ دیا تو کیا خرابی لازم آتی۔ حضرت نے فرمایا، خرابی یہ ہے کہ ترجمہ شریف میں حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم میں اسماعیل کو فضیلت دی اور اولاد اسماعیل میں کنانہ کو فضیلت دی اور کنانہ میں قریش کو اور قریش میں بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں مجھے فضیلت دی۔ اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ حضرت ابراہیم کے دو فرزندوں اہلق اور اسماعیل علیہم السلام میں حضرت اسماعیل کا نسب حضرت اہلق سے افضل تھا اور جس زمانہ میں نسل اہلق سے بنی اسرائیل کے انبیاء مبعوث ہوئے، اس وقت حضرت اسماعیل کی اولاد بھی موجود تھی اور ان کا نسب بنی اسرائیل کے انبیاء سے افضل تھا۔ اب اگر نبی کے لئے ضروری ہو کہ اس کا نسب اپنے زمانہ کے تمام انساب سے افضل ہو تو لازم آئے گا کہ بنی اسرائیل کے انبیاء عینہ رہیں۔ کیونکہ ان کا نسب اپنے زمانہ کے نسب اسماعیل سے افضل نہ تھا اور انبیاء بنی اسرائیل کی نبوت کے انکار سے بڑھ کر اور کون سی خرابی ہوگی۔ جب حضرت نے یہ ایراد قائم فرمایا تو مولانا ادریس کاندھلوی سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور مجلس وہیں پر خاست ہوئی۔ نیز اگلے ایڈیشن میں انہوں نے اس سے رجوع بھی کر لیا۔

## حاضر جوابی

☆ ۱۹۷۵ء میں رمضان المبارک کے جمعہ المبارک کے موقع پر راقم الحروف جامع مسجد شاعی عید گاہ، ملتان میں جمعہ کی نماز کے لئے حاضر ہوا۔ دوران تقریر کسی نے سوال کیا کہ آپ لوگ حضور ﷺ کی بہت تعریف کرتے ہیں اور حد سے زیادہ تعریف کرنا اللہ سے بڑھانا ہے۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، ”اللہ تعالیٰ کی کوئی حد ہے؟“ وہ کہنے لگا کہ ”نہیں، وہ تو لامحدود ہے۔“ آپ نے فرمایا، ”تو بھی، ہم کیسے بڑھا سکتے ہیں!“ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو گیا۔

☆ ۲۷ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ بمطابق ۱۵ فروری ۱۹۸۰ء بروز جمعہ المبارک راقم الحروف حضرت مولانا حامد علی خاں صاحب نقشبندی مجددی رامپوری علیہ الرحمہ کے چہلم پر جامع مسجد غوثیہ، قلعہ کینہ قاسم باغ، ملتان میں حاضر ہوا۔ حضرت علامہ قبلہ کاظمی صاحب نے دوران تقریر حیات اولیاء کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں نے مسئلہ حیات النبی پر تقریر کی تو ایک ڈاکٹر صاحب، جن کی دوکان لوہاری روڈ (ملتان) کے باہر ہے، انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ کاظمی صاحب ویسے ہی عقیدت کی بنا پر کہہ رہے ہیں، میں نہیں مانتا کہ قبر میں بھی کوئی زندہ ہوتا ہے۔

☆ قبلہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ میں اس ڈاکٹر کی دوکان پر چلا گیا۔ اتفاق سے اس ڈاکٹر کی دوکان کے سامنے ایک حاملہ اونٹنی کھڑی تھی۔ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب آپ قبر میں تو کسی کو زندہ نہیں مانتے لیکن اس اونٹنی کے پیٹ میں جو بچہ ہے، وہ تو زندہ ہے۔ کہنے لگا، ہاں زندہ ہے۔ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ اگر اس بچہ کو نکال کر اس اونٹنی کے پیٹ میں آپ کو بند کر دیا جائے تو کیا آپ زندہ رہیں گے۔ اگر اس میں بچہ زندہ ہے تو آپ کو بھی زندہ رہنا چاہئے۔ کہنے لگا کہ یہ نظام اور ہے۔ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ اگر یہ نظام اور ہے تو وہ قبر کا نظام بھی اور ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔

☆ ۱۵ ذیقعدہ ۱۴۰۰ھ بمطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۸۰ء بروز جمعہ المبارک جامع مسجد شاعی عید گاہ، ملتان میں راقم الحروف حاضر تھا۔ دوران تقریر حضرت علامہ کاظمی صاحب سے کسی نے اعتراض کیا کہ آپ لوگ حضور ﷺ کی بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں حالانکہ التبیات میں ہے کہ ”لَا تُشْهِدُ أَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ“ یعنی ”میں کو اپنی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے ہیں۔“ تو بندے کی تعریف کرنی چاہئے۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ بھی التبیات میں ”لَا تُسَلِّمُ عَلَيْكَ إِلَّا هِيَ النَّبِيُّ“ بھی تو ہے۔ اگر حضور ﷺ عام بندے ہیں اور ان میں کوئی تخصیص و فضیلت نہیں تو آپ التبیات میں ”لَا تُسَلِّمُ عَلَيْكَ إِلَّا هِيَ النَّبِيُّ“ کیوں نہیں کہتے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ عبد خاص ہیں اور ایسے عبد کہ تمام



عباد اللہ میں ممتاز ہیں۔ عبد کے معنی بندہ ہیں۔ بندہ غلام کو بھی کہتے ہیں، جو کسی کی ملک ہو تو سب بندے اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں۔ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ لیکن ان میں مراتب کا فرق ہے۔ دیکھیں، ایسے بندے بھی ہیں جو اللہ کو ماننے ہی نہیں اور نافرمان ہیں اور ایسے بندے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ماننے ہیں لیکن ان سے کچھ غلطیاں اور گناہ سرزد ہو جاتے ہیں اور ایک ایسے بندے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہر امر کی تعمیل کرتے ہیں۔

☆ جس طرح اللہ کو نہ ماننے والا، خدا کے ماننے والے گناہ گار بندے کے برابر نہیں، اسی طرح خدا کو ماننے والا گناہ گار بھی اللہ کے ماننے والے کامل و اکمل بندے کے برابر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ کے عبد ہونے کے یہ معنی نہیں کہ حضور ﷺ ہمارے جیسے بندے ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ حضور ﷺ معبود نہیں۔ الحمد للہ! ہمارا ایمان ہے کہ حضور ﷺ اللہ کے عبد ہیں اور جو عبد نہ ہو وہ معبود ہوتا ہے اور ہم حضور پر نور ﷺ کو عبد ماننے ہیں۔ مگر بقول علامہ اقبال علیہ الرحمہ

عبد	دیگر	عبد	چیز	دیگر
او	مراپا	انتظار	ابن	منظر

## شیعہ عالم سے گفتگو

☆ ۱۹۵۴ء کا واقعہ ہے کہ موضع احسان پور ضلع رحیم یار خان کے شیعہ حضرات نے اہلسنت کو مناظرہ کے لئے زبانی چیلنج کیا، جس کو اہلسنت نے منظور نہ کیا اور ان سے تحریری چیلنج کا مطالبہ کیا، مگر شیعوں نے صاف انکار کر دیا۔ اہلسنت نے شیعہ حضرات کے جلسہ کے ایام میں ایک تبلیغی جلسہ مقرر کر کے حضرت علامہ کاظمی صاحب علیہ الرحمہ اور بعض دوسرے علماء اہلسنت کو دعوت دی۔ صاحب دعوت محمد حسن صاحب نے شیعہ حضرات کے زبانی چیلنج اور جلسہ کا ذکر بھی کر دیا۔ حضرت علامہ کاظمی صاحب احتیاطاً ضروری کتابیں ہمراہ لے کر احسان پور تشریف لے گئے۔ حضرت قبلہ سلطان بالا دین اویسی صاحب بھی علماء اہلسنت کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ احسان پور پہنچ کر معلوم ہوا کہ مشہور شیعہ عالم مولوی اسماعیل آف کوہرہ منڈی (ضلع فیصل آباد) آج تمام دن اہلسنت کو اپنے مخصوص انداز میں مناظرے کا چیلنج دیتا رہا۔ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ مولوی اسماعیل صاحب کو یہیں بلا لیجئے۔ جو کچھ بات چیت ہوگی، ہمارے ان کے مابین بالمشافہ ہو جائے گی۔ چنانچہ بھد مشعل مولوی اسماعیل صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تشریف لے آئے۔ اہلسنت اور شیعہ کے داعیان جلسہ بھی موجود تھے اور ان کا خیال تھا کہ بنات النبی ﷺ اور نکاح اہم کلثوم اور باغ فدک کے مسئلہ پر سنی شیعہ علماء کی گفتگو ہو جائے اور ہم لوگ جانبین کی گفتگو سن لیں۔ جن لوگوں کے دل میں شکوک و شبہات ہیں، اس طرح وہ آسانی سے زائل ہو جائیں گے۔ لیکن مولوی اسماعیل صاحب بنات النبی ﷺ اور نکاح اہم کلثوم کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئے اور مسئلہ خلافت اور مسئلہ فدک پر مناظرہ کے لئے بار بار چیلنجے رہے۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نہایت متین، بنجیدہ مہذب اور باوقار عالم دین تھے۔ آپ کی گفتگو بھی نہایت بنجیدہ اور فاضلانہ تہذیب کے ساتھ تھی۔ علامہ کاظمی صاحب نے مولوی اسماعیل کو جو وی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ مولانا جس مسئلہ پر آپ گفتگو کرنا چاہیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ میں اسی مسئلہ پر گفتگو کروں گا، مگر یہ بتائیے کہ بنات النبی ﷺ اور نکاح اہم کلثوم کے مسئلہ پر گفتگو کرنے سے آپ اس قدر پہلو تہی کیوں فرما رہے ہیں۔ خلافت کا مسئلہ تو ایک بنیادی مسئلہ ہے، اس پر ضرور گفتگو ہونی چاہئے اور باغ فدک کے مسئلہ پر بھی بات کرنے کے لئے حاضر ہوں لیکن میری ناقص رائے میں اگر بنات النبی ﷺ اور نکاح سیدہ اہم کلثوم کا مسئلہ طے ہو جائے تو یہ مسئلہ باغ فدک کے فیصلہ کی بہ نسبت منزل مقصود سے زیادہ قریب ہوگا کیونکہ باغ فدک کے مسئلہ میں میرا منصب یہ ہوگا کہ میں دلائل کی روشنی میں اس امر کو ثابت کروں کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا باغ فدک نہ دینا ان کے حق میں موجب طعن نہیں اور آپ کا منصب یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ!) اس چیز کو آپ ان کے لئے موجب طعن ثابت کریں۔ ثبوت طعن آپ کا منصب ہے اور نشی طعن میرا ذمہ اور یہ ظاہر ہے کہ نہ ثبوت طعن کے لئے عدم ایمان و نشی خلافت حقہ لازم ہے، نہ نشی طعن ثبوت ایمان و خلافت کو سلب کر دیتا ہے۔ البتہ اگر بنات النبی ﷺ کا مسئلہ زیر بحث آ جائے اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عقد میں زمانہ اسلام میں (غیر مؤمنین کے ساتھ مومنات کا نکاح حرام ہونے کے بعد) نبی کریم ﷺ کی دو صاحبزادیوں کا ہونا دلائل سے ثابت ہو جائے۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی بیٹی اہم کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو یہ امر منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے بہترین ذریعہ اور قریب ترین راستہ ہے۔ مولوی اسماعیل صاحب کو جو وی حضرت علامہ کاظمی صاحب کے جامع کلام کو پوری طرح نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے یک لخت شور مچانا شروع کر دیا اور اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمانے لگے کہ وہاں کاظمی صاحب کبھی رشتہ داریوں سے بھی مسائل



حل ہوا کرتے ہیں۔ اگر حضور (ﷺ) کی بیٹیوں کا نکاح (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) سے یا (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کا نکاح انہم کلثوم (رضی اللہ عنہا) سے ثابت ہو جائے تو اس سے فقط رشتہ داری ثابت ہوگی، ایمان و خلافت کا ثبوت کیسے ہوگا؟ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ مولانا آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں رشتہ داری کو دلیل ایمان و خلافت نہیں بنارہا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مومنات کا نکاح غیر مومنین سے حرام کر دیا تو اگر اس حکم کے بعد حضور (ﷺ) یا حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کرم اللہ وجہہ کسی غیر مومن سے اپنی مقدس مومنہ صاحبزادی کا نکاح فرمائیں تو نعوذ باللہ حضرت محمد (ﷺ) اور حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کرم اللہ وجہہ انکریم فرمان خداوندی کے نافرمان قرار پائیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ آپ اسے محال ہی کہیں گے۔ اس لئے حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا غیر مومن ہونا بھی محال ہوگا۔ رشتہ داری کو ہرگز اپنے دعوئی کی دلیل نہیں بنانا۔ رشتہ داریوں کو دلیل بنانا تو آپ حضرات کا کام ہے۔ کیونکہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کرام کے صحابہ کرام پر افضل ہونے کی دلیل آپ کے نزدیک بھی قرابت اور رشتہ داری ہے، جسے آپ خواہ مخواہ میرے سر پر تھوپ رہے ہیں۔

☆ مولوی اسماعیل صاحب سے علامہ کاظمی صاحب کے ارشادات کا کوئی جواب نہ بن آیا اور کھیانے ہو کر دینی بائبل دہرائی شروع کیں۔ فرمانے لگے، رشتہ داریوں سے ایمان ثابت ہوتا تو آپ کے نزدیک حضور (ﷺ) کے والد مومن ہوتے۔ علاوہ ازیں رسول اللہ کی لڑکیوں کے متعلق آپ کے اہلسنت کا مذہب ہے کہ کافروں سے یا عیسیٰ لگیں۔ اب بتائیے رشتہ داری دلیل ایمان ہے تو ان کفار کو بھی آپ مومن تسلیم کرتے ہیں، جن سے حضور کی بیٹیوں کا نکاح ہوا تھا۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا کہ مولانا! حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ حضور (ﷺ) کی نورانی صاحبزادیوں کا نکاح زمانہ اسلام میں ہوتا تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آپ کے شیعہ علماء بھی نہیں چھپا سکتے۔ انشاء اللہ! آپ کی کتابوں سے ثابت کروں گا کہ حضرت ذوالنورین (رضی اللہ عنہ) کو بارگاہ نبوت سے یکے بعد دیگرے دو دور (دو صاحبزادیوں کی شکل میں) زمانہ اسلام میں عطا ہوئے۔ آپ اس مسئلہ پر گفتگو کے لئے آمادہ ہو جائیں، پھر آپ پر واضح کر دیا جائے گا کہ بے بنیاد روایات سے فریب دینی کا پردہ کس طرح چاک کیا جاتا ہے۔ آپ ایک روایت ایسی پیش کریں کہ حضور نبی کریم (ﷺ) نے زمانہ اسلام میں کسی بے دین کے ساتھ اپنی صاحبزادی کا نکاح کیا ہے اور مجھ تعالیٰ میں آپ کی مستند کتابوں سے ابھی ثابت کروں گا کہ حضور (ﷺ) نے زمانہ اسلام میں اپنی دو صاحبزادیوں کا نکاح (یکے بعد دیگرے) حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) سے اور حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کرم اللہ وجہہ نے اپنی بیٹی حضرت اُمّ کلثوم (رضی اللہ عنہا) کا نکاح حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے کیا۔ حضور (ﷺ) کے والدین کریمین کا مسئلہ تو اسے آپ نے بالکل بے محل پیش کر دیا۔ اول تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رشتہ داری میرے نزدیک ہرگز دلیل ایمان نہیں بلکہ نبی کریم (ﷺ) اور حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کرم اللہ وجہہ کا آپ کے مستند اصول کے موافق احکام خداوندی کی نافرمانی سے پاک ہونا حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے ایمان کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ میرا مسلک اس مسئلہ میں یہ ہے کہ حضور سرور کونین (ﷺ) کے والدین کریمین مومن تھے۔

☆ مولوی اسماعیل صاحب حضرت علامہ کاظمی صاحب کے اس واضح اور روشن جواب کو بھی نہ سمجھ سکے۔ بڑے زور سے چلا کر بولے۔ ارے مسلمانو! میں سنیوں کی پانچ سو کتابوں سے ابھی ثابت کر سکتا ہوں کہ سنیوں کے مذہب میں رسول اللہ کے والدین کفر پر مرمے اور ہائے مسلمانو! رسول اللہ کی کتنی تو بین ہو گئی۔ ہائے رسول اللہ کے والدین کونی کافر کہتے ہیں۔ دیکھو، یہ بیٹوں کی کتاب ہے، اس میں لکھا ہے، مانا علی الکھر (شرح فقہ اکبر)

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے نہایت فاضلانہ انداز میں فرمایا کہ مولانا! آپ کی گفتگو مجھ سے ہو رہی ہے، نہ کہ ان حاضرین سے۔ آپ میری طرف متوجہ ہو کر بات کیجئے۔ میں آپ کو جواب دوں گا۔ ان عوام سے آپ کیا مخاطب فرما رہے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ حضور (ﷺ) کے والدین کریمین کے ایمان یا عدم ایمان کی صراحت کسی نص قطعی میں وارد ہوئی ہے یا نہیں؟ اگر وارد ہوئی ہے تو وہ نص قطعی پیش فرمائیں، ورنہ انکار کریں کہ یہ مسئلہ منصوص قطعی نہیں۔ مولوی اسماعیل صاحب اس سوال کا کوئی جواب نئی یا اثبات میں نہ دے سکے۔ علامہ کاظمی صاحب نے مکر فرمایا کہ مولانا فرمائیے۔ حضور (ﷺ) کے والدین کریمین کے ایمان یا عدم ایمان کی صراحت کسی نص قطعی میں ہے یا نہیں؟ لیکن مولوی اسماعیل صاحب مبہوت ہو کر رہ گئے۔ بلا آخر علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ مولانا! میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ نص قطعی میں منصوص و مصرح نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ جو مسئلہ منصوص قطعی نہ ہو وہ ظنی اور کبھی مجتہد فیہ ہوتا ہے۔ علماء نے کتاب و سنت کے دلائل میں غور و خوض کیا اور اپنے اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ اجتہادی مسائل میں عموماً اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ بین العلماء ہو گیا۔ بعض نے عدم ایمان کا قول کیا اور بعض نے ایمان کا اور بعض نے سکوت اختیار کیا۔ چونکہ تینوں قول اجتہادی ہیں، اس لئے کسی کے قائل کی تھلیل و تفسیق نہیں کی جاسکتی۔ محض رشتہ داری ہمارے نزدیک دلیل ایمان نہیں جیسا



کہ آپ کے نزدیک ہے۔ اس لئے اجتہاد اور دلائل میں غور و خوض کی ضرورت پڑی اور اختلاف واقع ہوا لیکن مصلح دین سے چونکہ اس مسئلہ کو تعلق نہیں اس لئے ہمارے نزدیک یہ فردی مسائل میں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس مسئلہ کے ذکر سے بجز نقصان کے آپ کو کیا فائدہ پہنچا؟

☆ مولوی اسماعیل صاحب پھر وہی بڑے زور سے دونوں ہاتھ رانوں پر مار کر فرمانے لگے، ہائے مسلمانو! غضب ہے۔ رسول اللہ کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی تو بین ہو سکتی ہے کہ حضور کے والدین کو کافر کہا جائے۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، اچھا مولانا یہ فرمائیے کہ حضور ﷺ کے والدین کریمین کے ایمان کا مسئلہ آپ کے نزدیک اصولی ہے یا فردی؟ مولوی اسماعیل صاحب اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ دے سکے۔ علامہ کاظمی صاحب نے مکر فرمایا، مولانا! فرمائیے، آپ بولتے کیوں نہیں۔ جلدی بتائیے، آپ کے نزدیک یہ مسئلہ اصولی ہے یا فردی؟ قبلہ کاظمی صاحب کے بار بار ردیافت فرمانے پر بھی مولوی اسماعیل صاحب خاموش رہے۔ بالآخر شیخ مفتی عابد حسین آف ڈیرہ غازی خان کہنے لگے کہ یہ مسئلہ اصولی بھی ہے، فردی بھی۔ مولوی عابد حسین کے اس انوکھے جواب پر اہل فہم حاضرین ہنس پڑے تو مولوی اسماعیل صاحب جلدی سے فرمانے لگے، نہیں نہیں، ہمارے نزدیک یہ مسئلہ فردی ہے۔

☆ قبلہ کاظمی صاحب نے نہایت متین انداز میں فرمایا کہ مولانا! ابھی تو آپ ارشاد فرما رہے تھے کہ مسلمانو! رسول اللہ کی اس سے بڑھ کر کیا تو بین ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین کو کافر کہہ دیا جائے۔ آپ کے اس ارشاد کا واضح مطلب یہی ہے کہ اس مسئلہ میں ایمان نہ ماننے کا قول تو بین رسول ہے۔ اب آپ اس مسئلہ کو فرما رہے ہیں آپ کی ان دونوں باتوں کا صاف نتیجہ ہے کہ تو بین رسول کا مسئلہ بھی آپ کے نزدیک فردی ہے۔ العباد باللہ! کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہو سکتا، جو اس وقت آپ نے ظاہر فرمایا۔ مولوی اسماعیل صاحب اور اس کے ساتھی قبلہ کاظمی صاحب کی اس گرفت سے جانبر نہ ہو سکے۔

## عیسائی مبلغ کا قبول اسلام

☆ مولانا ابن بشیر صاحب دہلوی اس مبارک موقع پر موجود تھے، جس میں عبدالمسیح صاحب مبلغ عیسائی مشنری نے اسلام قبول کرنے کا اعلان فرمایا۔ علامہ ابن بشیر صاحب مدرسہ عربیہ انوار العلوم کے فاضل ہیں۔ انہوں نے یہ ایتر ویمنٹ روزہ ”سیر و سفر“ ملتان کے لئے حاصل کیا تھا۔ ماہنامہ السعد (ملتان) جولائی ۱۹۶۳ء نے بھی یہ ایتر ویمنٹ شائع کیا۔

☆ ۱۷ جون کی شام مدرسہ عربیہ انوار العلوم میں روح پرور اجتماع تھا، جس میں ایک عیسائی مبلغ نہایت شہرت اور فہم عربی میں اپنے اسلام لانے پر فخر کرتے ہوئے یہ اعلان کر رہا تھا

☆ ”میں نے اسلام کو دین حق پایا۔ یہ دین صحیح معنی میں وحدانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ اب میں کوای دیتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم خدا کے رسول اور اس کے بندے ہیں اور خدا وحدہ لا شریک ہے۔ مجھے اسلام لانے پر فخر ہے۔“

☆ عبدالمسیح (سابقہ نام) کی یہ تقریر قریباً نصف گھنٹہ جاری رہی۔ اس کے بعد علامہ کاظمی صاحب نے ان کو کلمہ طیبہ پڑھایا۔ دین پر استقامت کی تلقین فرمائی اور ان کا نام عبدالرحمن رکھا اور حاضرین کو مختصر یہ بتایا کہ ان سے ملاقات کب ہوئی تھی اور پانچ یوم سے ملتان میں کن کن مسائل پر گفتگو ہوئی اور علمی و عقلی دلائل سے کس طرح یہ ثابت کیا گیا کہ اسلام دین حق ہے۔ خداوند تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ اس کی ذات ”کَم بَلَدٌ وَکَم بُؤَدٌ“ ہے۔ حاضرین نے پر جوش نعرہ ”عکبر و رسالت بلند کئے اور اسلام زندہ باد“ کے نعرے سے اپنے بھائی کا استقبال کیا اور علامہ کاظمی صاحب کی علییت پر نعرہ ”عکبر و رسالت بلند کئے۔“

☆ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نو مسلم عبدالرحمن سے عرض کیا کہ میں آپ سے جریدہ ”سیر و سفر“ کے لئے ایتر ویمنٹ چاہتا ہوں۔ عبدالرحمن صاحب نے فرمایا کہ اس وقت تو بے حد مصروفیت ہے۔ کل کوئی سا وقت رکھ لیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور واپس چلا آیا۔

☆ دوسرے روز صبح ۹ بجے مدرسہ انوار العلوم پہنچا۔ دارالحدیث میں حضرت علامہ کاظمی صاحب اور عبدالرحمن صاحب مع چند علماء و طلباء تشریف فرما تھے۔ علامہ کاظمی صاحب عبدالرحمن صاحب سے عربی میں گفتگو کر رہے تھے۔

☆ عبدالرحمن صاحب کے متعلق عرض کروں کہ ان کو عربی، انگریزی اور اردو پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ وہ ہر سہ زبانون کو مادری زبانوں کی طرح بولتے ہیں۔



انجیل اور قرآن پر گہری نظر ہے۔ مسیحیت اور اسلام کا بڑا گہرا مطالعہ ہے۔ پاکستان، ہندوستان، ایران، شام اور مصر میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ ہر بات مدلل طریقہ پر کرتے ہیں اور دوسرے سے بھی دعوے کے ساتھ دلیل طلب کرتے ہیں۔ بڑے بڑے علماء سے ملاقاتیں کر چکے ہیں بلکہ بعض کو تو عیسائیت کی دعوت بھی دی ہے۔ علامہ کاظمی صاحب جب گھنگو سے فارغ ہوئے تو میں نے اپنا منشا ظاہر کیا۔ عبدالرحمن صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے ان کی مسکراہٹ کو رضامندی پر محمول کرتے ہوئے اپنے سوال کی ابتداء کی۔

سوال ☆ آپ یفرمایے، وہ کون سی بات تھی، جس نے آپ کو اسلام کی طرف متوجہ کیا۔ کوئی خاص واقعہ تھا یا کسی مسلمان کی زندگی سے آپ متاثر ہوئے؟

جواب ☆ عبدالرحمن صاحب نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا، مجھے متاثر کرنے والے صرف اسلام کے ذریعے اصول تھے۔ کوئی واقعہ یا شخصیت نہیں۔

☆ میں نے ذرا وضاحت چاہی تو فرمانے لگے۔ دیکھیے، اصل چیز وحدانیت ہے۔ آپ نظام کائنات پر غور فرمائیں تو یہ چیز واضح ہوگی کہ اس نظام کو قائم کرنے اور چلانے والی کوئی ذات ضرور ہے۔ یہ سب کچھ اپنے آپ نہیں ہو رہا بلکہ کسی کے حکم کے ماتحت ہے۔ پھر نظام کائنات کا احسن طور پر ہونا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وہ ذات ذات واحد ہے۔ اگر چند خدا ہوتے تو فساد برپا ہو جاتا اور یہ حسن ترتیب مافی نہ رہتی۔ میں نے اسلام اور دیگر مذاہب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ مجھے اسلام میں وحدانیت ہی ملی۔ دوسرے مذاہب میں تثلیث ہے۔ کہیں مختلف شکلوں میں خدا کی جلوہ نمائی ہے، کہیں ستاروں کی پرستش ہے تو کہیں سورج کی پوجا۔ خود عیسائیت میں کہیں یہ تصور ملتا ہے کہ خدا پہلے چھپا ہوا تھا، پھر شکل سچ جلوہ نما ہوا۔ کہیں حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مان کر تین کے درمیان مشترک مانا جاتا ہے۔ اس بات نے مجھے مجبور کیا کہ میں قرآن کا مطالعہ کروں۔

سوال ☆ قرآن کے مطالعہ سے آپ پر کیا اثر مرتب ہوا؟

جواب ☆ قرآن کے واضح دلائل نے یہ ثابت کیا کہ خدا ”وہدہ لاشریک“ ہے۔ وہ ”کَم یَلِدُ وَکَم یُوَلِّدُ“ ہے۔ وہ خاندان، عزیز و اقارب سب سے پاک ہے۔ پھر قرآن کا انداز بیان، اس کی فصاحت و بلاغت، اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ بندے کا کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے۔

سوال ☆ پھر تو آپ کو قرآن کے مطالعہ کے بعد ہی مسلمان ہو جانا چاہئے تھا۔ تاخیر کا کوئی خاص سبب تھا؟

جواب ☆ آپ کا خیال صحیح ہے۔ مگر قرآن پاک کی بعض آیات کے متعلق میرے کچھ شبہات تھے۔ میں ان کے تلی اور تفنی بخش جواب چاہتا تھا۔

سوال ☆ تو آپ نے اس سلسلہ میں علماء سے ملاقات کی؟

جواب ☆ جی ہاں! میں نے بہت سے علماء سے ملاقات بھی کی اور خط و کتابت بھی۔ ہر طرح سے سوال و جواب جاری رہے۔ میں پھر سوال و جواب پر اعتراض کرتا تھا اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ بعض نے میرے متعلق یہ خیال کیا کہ میں صرف ان حضرات کو پریشان کر رہا ہوں۔ بعض نے الزامی جوابات دیے، بعض غصے ہو گئے۔ بعض نے کہا، پھر کسی وقت ملاقات کرنا۔ ہم اور علماء کو کج کریں گے۔

سوال ☆ آپ کی علامہ کاظمی صاحب سے کب ملاقات ہوئی اور کس طرح؟

جواب ☆ جیسے میں نے ابھی عرض کیا کہ میں اپنے شبہات کے سلسلہ میں علماء سے ملاقات کرتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ تم کاظمی صاحب سے ملاقات کرو۔ وہ محرم میں کراچی تشریف لائیں گے۔ یہ ایک سال قبل کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں کراچی میں تھا۔ ذی الحجہ کے آخری ایام تھے۔ میں ملاقات کرنے کے لئے ٹھہر گیا۔ جب حضرت کاظمی صاحب کراچی تشریف لائے۔ میں نے آپ کی تقریر آرام باغ میں سنی۔ میں نے ایک پرچہ لکھ کر بھیجا، جس میں اعتراض کیا گیا تھا۔ کاظمی صاحب نے اس کا مدلل جواب دیا۔ میں نے سوچا، ان سے ضرور ملاقات کیجائے۔ ویسے بھی کراچی کے اکثر علماء مجھ سے شناسا تھے۔ دوسرے روز مجھے کاظمی صاحب کی خدمت میں ہاؤسنگ سوسائٹی لے جایا گیا۔ میری حضرت علامہ کاظمی صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ میرے اعتراضات کا انہوں نے جواب دیا۔ مگر ان کی مصروفیت اور مختصر قیام کی وجہ سے طویل ملاقات نہ ہو سکی۔ علامہ کاظمی صاحب نے مجھے ملتان آنے کی دعوت دی اور دعوت اسلام بھی پیش کی۔ میں نے عرض کیا، ”آؤ کر“، یعنی میں سوچوں گا۔

☆ ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ خلش باقی تھی۔ میں تشفی چاہتا تھا۔ کراچی سے حیدرآباد، سکھرا اور بہاولپور میں مختلف علماء سے گھنگو کی مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔



میں نے سوچا ملتان قریب ہے۔ کاظمی صاحب نے بھی دعوت دی تھی۔ میرے دل میں ان کے جوابات کی لذت ابھی تک باقی تھی۔ میں ملتان آ گیا۔

سوال ☆ آپ کتنے یوم کاظمی صاحب سے مناظر فرماتے رہے؟ اور کن مسائل پر گفتگو ہوتی رہی؟

جواب ☆ میں نے پانچ دن تک کاظمی صاحب سے ان تمام مسائل پر گفتگو کی جن کے متعلق میرے ذہن میں عرصہ سے شبہات تھے اور ان کے تسلی بخش جواب مجھے نہیں ملے تھے۔

سوال ☆ اب آپ کو تسلی ہوگئی یا کچھ شبہات باقی ہیں؟

جواب ☆ میرا ایمان لانا یعنی دین اسلام کو قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ میں مطمئن ہو گیا ہوں۔

سوال ☆ اپنے کچھ اعتراض آپ بتا سکتے ہیں جن کی تفسیر کاظمی صاحب نے فرمائی؟

جواب ☆ پانچ روز کی گفتگو مکمل طور پر تو نہ بتا سکوں گا، البتہ چند اہم اعتراض اور شبہات بتائے دیتا ہوں۔

☆ ”ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْاُفُقَيْنِ“ کے متعلق میرا شبہ یہ تھا کہ جب خدا عرش پر رونق افروز ہے اور عرش مسلمانوں کے نزدیک محدود ہے تو اس پر بیٹھنے والا بھی محدود ہوگا حالانکہ خداوند تعالیٰ ہر لحاظ سے یعنی ذات اور صفات کے لحاظ سے غیر محدود ہے تو پھر اس آیت کا کیا مفہوم ہوگا؟

سوال ☆ کاظمی صاحب نے اس کا جواب کیا دیا؟

جواب ☆ کاظمی صاحب سے ہی معلوم فرمائیں، وہ آپ کو بہت بہتر طریقے سے بتا سکیں گے۔

☆ میں حضرت علامہ کاظمی صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ عرض کیا، حضرت آپ فرمائیں۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، ”اسْتَوَىٰ عَلَى الْاُفُقَيْنِ“ کے معنی جو انہوں نے سمجھے ہیں، وہ صحیح نہیں۔ ”اسْتَوَىٰ“ بمعنی ”جَلَسَ“ نہیں ہے بلکہ بمعنی ”اسْتَعْلَىٰ“ ہے۔ پروردگار کی بلندی اور غلبہ مراد ہے نہ کہ رب کا بیٹھنا۔ اس صورت میں وہ شبہ ختم ہو جاتا ہے جو غلط مفہوم لینے سے پیدا ہوتا ہے۔

☆ میں نے پھر عرض کیا ان کا دوسرا اعتراض کیا تھا؟

☆ کاظمی صاحب نے فرمایا، ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قرآن پاک کی آیت ہے، ”وَمَا ارْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ اِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ“ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے نہیں کوئی رسول بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ۔

☆ ان کا اعتراض یہ ہے کہ آپ کی زبان تو اردو ہے۔ نبی کی زبان عربی تھی تو پتہ چلا کہ ان کی بحث آپ کی طرف نہ تھی، صرف عربوں کے لئے تھی۔ کیونکہ قرآن ”بِلِسَانِ قَوْمِهِ“ فرما رہا ہے۔ یہ کہ جوئی کا نزول اردو میں بھی ہوا ہو۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، میں نے جواب دیا ہے کہ قوم اور امت میں فرق ہے قوم سے مراد یہ ہے کہ جس میں نبی کی پیدائش ہو، وہ نبی کی قوم ہے۔ ہم نبی کی امت ہیں تو ہمیں قرآن نے ”بِلِسَانِ قَوْمِهِ“ نہیں فرمایا بلکہ ”بِلِسَانِ قَوْمِهِ“ فرمایا ہے۔ نبی کی زبان وہ ہوتی ہے، جس قوم میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر ”بِلِسَانِ قَوْمِهِ“ ہوتا تو اعتراض درست ہوتا مگر اس آیت میں ”بِلِسَانِ قَوْمِهِ“ ہے۔ لہذا یہ اعتراض بھی درست نہیں۔

☆ میں نے پھر عرض کیا، کوئی اور اہم سوال جو انہوں نے کیا ہو، وہ بھی فرمادیں۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، یہ چار پانچ دن اعتراضات اور ان کے جوابات دینے میں ہی گزرے ہیں، آپ کیا کیا نوٹ کریں گے۔ میں نے عرض کیا پھر بھی کچھ نہ کچھ تو اور فرمائیں۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، ایک اعتراض یہ بھی تھا قرآن کریم کی آیت ہے۔ ”مَصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِنَ التَّوْرَةِ وَالْاِنْجِيلِ“ (سورۃ المائدہ آیت ۴۸۔ پ ۶) جس کا معنی یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کا نبی تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تمہارے پاس تو ریت اور انجیل سے ہے تو جب خدا کا نبی تصدیق کر رہا ہے تو تو ریت اور انجیل تحریف شدہ نہیں ہو سکتی۔ اگر تحریف شدہ ہے تو تصدیق کیسی؟ اور وہ بھی نبی کی۔ پتہ چلا کہ مسلمانوں کا یہ اعتراض غلط ہے کہ تو ریت اور انجیل میں تحریف ہوئی۔

سوال ☆: آپ کا کیا جواب تھا؟



جواب ☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، میں نے ان کو بتایا کہ ”مِنْ التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ“ میں مِنْ بیان یہ ہے۔ جسکے معنی یہ ہیں کہ خدا کا نبی تصدیق کرنا والا ہے، انکی جو تو رات اور انجیل میں سے ہے۔ ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کہ ہم تو رات اور انجیل کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس پر ایمان رکھتے ہیں جو منزل من اللہ ہے اور یہی مفہوم ہے اس آیت کا تو ریت اور انجیل سے جو ہے خدا کا نبی اس کا مصدق ہے۔

☆ علامہ کاظمی صاحب سے میں نے عرض کیا، آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرنا ہوں۔ آپ کی عظیم قابلیت اور قوی دلائل سے ان کے شبہات دور ہو گئے اور خداوند قدوس نے ان کو ہدایت فرمائی۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، اصل بات یہ ہے کہ ”وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ“ پروردگار نے جب چاہا، ہدایت فرمادی۔ میرے دلائل یا علیت کو دخل نہیں۔ دوسرے علماء کرام نے بھی ان کو یہی جواب دیے ہوں گے۔ مگر اب پروردگار نے ان سے غفلت کے پردے دور فرما دیے اور ان کو ہدایت نصیب ہوئی۔ دعا کرو کہ پروردگار انہیں استقامت عطا فرمائے۔

☆ میں نے عبدالرحمن صاحب سے عرض کیا، علامہ کاظمی صاحب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا، آپ کی علیت کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ میرے شبہات کی تسکین کاظمی صاحب نے فرمائی۔ آپ کی شخصیت علمی دنیا میں مایا ز شخصیت ہے۔ حاضر جوانی قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ حافظہ غضب کا ہے اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے علم پر غرور اور تکبر نہیں۔ آپ کی ذات انکساری اور محبت کا نمونہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ علامہ سید احمد سعید کاظمی صاحب ملتان میں ایک عظیم علمی شخصیت تھے۔ ملتان کے علمی حلقے علامہ موصوف کے تخر علمی اور انداز بیان سے بے حد متاثر تھے۔ کاظمی صاحب کی علمی کاوشوں نے ملتان کی عظمت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کی زندگی میں ایک عرصے کا اور اضافہ کر دیا۔

## انبیاء کرام کی موت کے بارے میں ایک سوال

☆ جامعہ انوار العلوم، پکھری روڈ، ملتان کے سالانہ جلسہ دستار فضیلت کے موقع پر کسی نے علامہ کاظمی صاحب سے انبیاء کرام علیہم السلام کی موت کے اختیاری یا اضطراری ہونے کے بارے میں سوال کیا۔ علامہ کاظمی صاحب نے جواب میں فرمایا، ہم اہلسنت کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جو اختیار ہوتا ہے، وہ خود بخود نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے دینے سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس مخلوق کو جو بھی اختیار دیتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دینے کے بغیر کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ دیکھیے انسان کو بھی مختار کہا جاتا ہے، کیونکہ اگر وہ مختار نہ ہوتا تو اس سے مواخذہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کسی انسان کو اسکی عظمت پر اور اسکے جرم پر مواخذہ کرنا اور اسکی سزا دینا، یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب اختیار ہو۔ اور بغیر اختیار کے مواخذہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم کسی کے اختیار کو خدا کے دینے کے بغیر تسلیم کر لیں۔ کیونکہ خدا کے دینے کے بغیر اختیار کا عقیدہ رکھنا، یہ تو اللہ تعالیٰ کیساتھ دوسرے کو شریک بنانا ہے۔ اور ہم تو اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی کو شریک نہیں بناتے۔ جب یہ بات آپ سمجھ گئے تو بات واضح ہو گئی کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ جو موت دیتا ہے، وہ اختیاری ہوتی ہے اور وہ اختیار اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا میں رہے یا اللہ کے پاس چلا جائے تو اللہ کے اس بندے نے اللہ کے پاس جانے کو اختیار کر لیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یمن کر رو دیئے تو بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ اس بات میں رونے کی کیا وجہ ہے؟ لیکن جس طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی بات کو سمجھا، دوسرے صحابہ کرام نے نہیں سمجھا۔

☆ وہ سمجھ گئے کہ یہ اختیار موت کے بارے میں ہے۔ اور اختیار دینے والا اللہ ہے اور جس کو اختیار دیا گیا ہے، وہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں تو ثابت ہوا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی موت ہماری موت کی طرح اضطراری نہیں ہوتی بلکہ وہ اختیاری موت ہوتی ہے۔ موت کا فرشتہ جب نبی کی بارگاہ میں قبض روح کے لئے حاضر ہوتا ہے تو وہ اذن طلب کرتا ہے اور اس کے اذن طلب کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو اختیار دیتا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کی صحیح حدیث ہے کہ ملک الموت اذن طلب کے بغیر ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو ایک طمانچہ مارا۔ حدیث میں آیا ہے کہ ملک الموت کی آنکھ پھوٹ گئی۔ ملک الموت اللہ تعالیٰ کے دربار میں واپس گئے اور عرض کیا کہ اے اللہ! تو نے مجھے اپنے ایسے بندے کے پاس بھیجا جو تیرے پاس نہیں آتا چاہتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے ملک الموت! تم میرے اس مقدس اور پیارے بندے کے کلیم اللہ کے پاس پھر جاؤ اور ان سے کہو کہ آپ اپنا ہاتھ تیل کی پشت پر رکھ دیں، جتنے بال آپ کے ہاتھ



کے نیچے آ جائیں، ہر بال کے عوض آپ کی ایک سال عمر بڑھ گئی۔ ملک الموت حاضر ہوئے اور یہ پیش کش کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے کسی قسم کا کوئی توقف نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اے ملک الموت! آپ اذن طلب کئے بغیر آئے۔ اگر آپ اذن طلب کر کے آتے تو یہ بات نہ ہوتی۔ ہمیں اپنے رب کی بارگاہ میں جانے سے گریز نہیں۔ ہم تو اپنے رب کی بارگاہ میں جانے کے لئے تیار ہیں تو معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ملک الموت کو طمانچہ مارا اور آنکھ پھونڈ دی۔ وہ اسی بنا پر کہ انہوں نے اذن طلب نہیں کیا تھا اور اذن طلب کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ اپنے نبی کو اختیار دیتا ہے کہ چاہے دنیا میں رہے اور چاہے خدا کے پاس چلا جائے۔

☆ شاید کسی کے دل میں یہ خیال ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طمانچے سے ملک الموت کی ایک آنکھ پھوٹ گئی تو وہ ایک آنکھ سے رہ گئے۔ تو ایسی بات نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ”فرد اللہ علیہ عینہ“ یعنی اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کی آنکھ ان کو واپس کر دی۔ اور یہ جو صدمہ طاری ہوا، یہ صورت بشری پر طاری ہوا۔ ورنہ ملکیت کا مقام کچھ اور ہے اور نبوت کا مقام تو ملکیت کے مقام سے بھی اونچا ہے، اور اتنا اونچا ہے کہ اس بلندی کا کوئی مقام کوئی پائ نہیں سکتا۔ آپ مجھے بتائیں کہ اگر ملک الموت روح قبض کرنے کے لئے ہم میں سے کسی کے پاس آ جائے تو آپ ایمان سے بتائیں کہ ہم ملک الموت کے سامنے بے اختیار ہو جائیں گے یا نہیں۔ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا طاقت ور ہو، کتنا بڑا حاکم کیوں نہ ہو، موت کے فرشتے کو واپس نہیں کر سکتا۔ لیکن نبوت کا مقام یہ ہے کہ موت کا فرشتہ نبی کے سامنے بے اختیار ہے، اس کی روح قبض نہیں کر سکتا۔

☆ محدث ابن منیر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو طمانچہ مارا تو ان کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کے بازو میں اتنا زور اور ان کے طمانچے میں اتنی قوت تھی کہ ”لَسْتُ أَفْقَدُ لِسْمُوتَ السَّبْعِ مِنَ لُطْمَةِ مُوسَى“۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام اگر آسمانوں کو ایک طمانچہ مار دیں تو ساتوں آسمان چورہ چورہ ہو جائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام کے طمانچے میں اتنا زور ہے تو کیا وجہ ہوئی کہ ملک الموت کی صرف ایک آنکھ پھوٹی؟ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ پورے ختم ہو جاتے۔ کیونکہ جب اتنا زور ہے کہ ساتوں آسمان چورہ چورہ ہو جائیں تو ملک الموت بھی انہی آسمانوں کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہیں تو یہ بھی ختم ہو جاتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ملک الموت کی صرف ایک آنکھ پھوٹی، اس کی وجہ کیا تھی؟ ابن منیر رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقدر فرما دیا تھا کہ قیامت تک کے انسانوں کی روح نکالنے والے ملک الموت ہیں تو اس لئے موسیٰ علیہ السلام کے طمانچے سے فقط ان کی ایک آنکھ پھوٹی اور باقی صحیح سالم رہے۔ اور اسکی وجہ فقط یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بازو میں کمزوری پیدا نہیں ہوتی تھی، بلکہ تقدیر الہی حائل ہو گئی تھی اور اس تقدیر الہی نے ملک الموت کو ختم ہونے سے بچا لیا۔ اگر تقدیر الہی حائل نہ ہوتی تو ملک الموت علیہ السلام کا وجود ہی باقی نہ رہتا۔ جب بازو نے حکیم میں اتنا زور اور اتنی طاقت ہے تو بازو نے حبیب کے زور کا کیا عالم ہوگا؟ اب یہ زور کیا ہے؟ ارے یہی تو طاقت ہے۔ یہی تو اختیار ہے اور یہی قدرت ہے۔ تو اب اگر ہم کہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی موت بھی فطری ہوئی ہے تو بھائی ان لوگوں کی موت فطری ہوتی ہے جو نبی کی بجائے حتمی ہو جائیں اور ان کو اتنا اختیار بھی نہیں ہوتا کہ وہ بیت الخلا سے گھر واپس جا سکیں تو جہاں اتنا بھی اختیار نہ ہو تو سمجھ لو کہ وہاں نبوت نہیں ہے۔ نبوت کا مقام تو یہ ہے کہ اگر ایک طمانچہ ماریں تو ”لَسْتُ أَفْقَدُ لِسْمُوتَ السَّبْعِ“ ساتوں آسمان چورہ چورہ ہو جائیں۔ یہ کمال قدرت ہے اور کمال اختیار ہے۔ مگر یہ اختیار انبیاء علیہم السلام کا اپنا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار دیا ہے تو ہم سے الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ الجھتا ہے تو خدا سے الجھو کہ یہ اختیار کیوں دیا ہے؟ ہمارا تو اس میں قصور ہے نہیں۔ اور میں تو بارگاہ نبوت کو اتنا اختیار رکھتا ہوں کہ جہاں ساری کائنات بے اختیار رہی وہاں با اختیار ہوتا ہے۔ لہذا نبی کی موت کا قیاس اپنی موت پر کرنا یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خوش عقیدگی نصیب فرمائے اور بد عقیدگی سے بچائے۔

## فوائد حدیث

☆ جامعہ اسلامیہ (بہاولپور) میں ایک مرتبہ حدیث پڑھاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ایک تابعی نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی۔ اس پر ایک طالب علم نے سوال کیا کہ تابعی تو وہ ہوتا ہے، جس نے رسول اکرم ﷺ کو نہ دیکھا ہو بلکہ آپ کے صحابی کو دیکھا ہو۔ تو تابعی حضور سے کیسے روایت کر سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا، ایک صحابی نے حضور ﷺ سے حدیث سنی، بعد میں وہ اکیوا ذاب اللہ مرتد ہو گیا اور ”مَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ“ مرتد ہونے کے بعد اس کے تمام اعمال اکارت ہوئے۔ شرف صحابیت بھی جاتا رہا۔ حضور کے وصال کے بعد وہ پھر ایمان لے آیا اور اس نے صحابہ کو دیکھا، اب وہ تابعی ہوا۔ اس کے بعد اگر وہ حضور سے سنی ہوئی کسی روایت کو بیان



کرے تو وہ حضور سے تابعی کی روایت ہوگی، صحابی کی نہیں۔

☆ آپ سے سوال کیا گیا کہ بخاری شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے عبد اللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں استغفار سے منع فرمایا ہے

”إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ أَنَّهُمْ سَبَّحُوا اللَّهَ فَلَنْ يُغْفَرَ لَهُمْ“ (ب ۱۰ - س توبہ - آیت ۷۹)

☆ نیز جب آپ کے استغفار کے باوجود اس کی مغفرت نہ ہوئی تو آپ کی شان محبوبی اور استجاب دعا پر حرف آیا علامہ کاظمی صاحب نے جواب میں فرمایا، حضور نے عبد اللہ بن ابی کے لئے دعا کب مانگی۔ نماز جنازہ میں آپ نے فرمایا، ”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَبِيبِنَا وَمَنْبِتِنَا“ اے اللہ! بخش دے ہمارے مزدوں کو اور ہمارے مردوں کو۔ اور وہ ہمارا کب تھا؟ جو کہتے ہیں ہمارا ہے انہیں مبارک ہو۔ رہا یہ سوال کہ کیا کوئی شخص اب بھی کسی مرتد کا جنازہ اس تاویل سے پڑھ سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا، ”وَلَا تَصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَتَدَا“ (س توبہ آیت ۸۳) ان میں سے کسی کی نماز جنازہ نہ پڑھیں۔ حضور نے اس کی نماز جنازہ اس آیت کے نزول سے پہلے پڑھی تھی۔ لہذا حضور کا عمل جائز تھا اور اب جو پڑھائے گا، اس کا فعل ناجائز ہوگا۔ بانی یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اگر آپ اس کے لئے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں تو میں نہیں بخشوں گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وسیع القسمی، علم اور رحمت کا تو یہی تقاضا تھا کہ آپ اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی استغفار چاہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمادیا کہ میں سب کو معاف کر سکتا ہوں مگر محبوب کے گناہوں کو معاف کرنا، یہ تو قانونی محبت کا خلاف ہے۔ جس طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا میرا نام (محمد رسول اللہ) کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ لیکن حضرت علی نے یہ نام نہیں کاٹا اور فرمایا، ”لَا تَكُونُكَ أَتَدَا“ اور ان کا یہ نام نہ کاٹنا اور آپ کی بات کا نہ ماننا اور ”لَا تَكُونُكَ أَتَدَا“ کہنا آپ کی محبت کی وجہ سے تھا۔ اسی طرح آپ کے استغفار کے باوجود اللہ تعالیٰ کا عبد اللہ بن ابی منافق کو نہ بخشا اور ”لَنْ يُغْفَرَ اللَّهُ لَهُمْ“ فرماتا آپ کی محبت کی جہت سے تھا۔

☆ ایک مرتبہ حضرت علامہ کاظمی صاحب سے کسی نے پوچھا کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضرت عمر کی یہ رائے تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے اور حضرت ابو بکر صدیق اور بعض دوسرے صحابہ کی رائے یہ تھی کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر کی رائے کو پسند کر لیا تھا اور بعد میں قرآن حضرت عمر کی رائے کے مطابق نازل ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ”تَسْرِبُونَ عَرْضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ“ (س الانفال) تم مال دنیا کا ارادہ کرتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے۔ اس سے لازم آیا کہ حضرت عمر کی رائے حضور کے مقابلہ میں صحیح ہو۔ علامہ کاظمی صاحب نے جواب میں فرمایا، یہ وعید ان لوگوں کی طرف متوجہ ہے جو نئے نئے اسلام میں آئے تھے اور جنہوں نے مال دنیا کی طرح فدیہ کی رائے دی تھی اور حضرت ابو بکر صدیق نے ان کے اسلام قبول کر لینے کی توقع سے، انہیں چھوڑنے کی رائے دی تھی تاکہ ان کی آخرت سنور جائے۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے اس رائے کو پسند کیا اور اسی بات کو پسند فرما کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ“ اللہ تعالیٰ آخرت کا ارادہ کرتا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر ﷺ کی رائے کو اپنی رائے قرار دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے ان لوگوں کے مقابل بہتر تھی، جنہوں نے مال دنیا کی طرح فدیہ کی رائے دی تھی اور جس رائے کو حضور ﷺ نے پسند فرمایا تھا یعنی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے، وہ مطلقاً بہتر تھی۔

☆ اعلیٰ حضرت کا فاضل بریلوی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ شمول الاسلام میں لکھا ہے کہ امام رازی نے ”الَّذِي يَرَاكَ جِبِينَ تَقْدُومٍ وَتَقَلُّبِكَ فِي السَّاجِدِينَ“ کے تحت حضور کے والدین کریمین کے ایمان کو بیان کیا ہے۔ جب ہم نے تفسیر کبیر میں اس آیت کی تفسیر دیکھی تو یہ مسئلہ نہ ملا بلکہ اس کے برعکس یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے۔ جب حضرت علامہ کاظمی صاحب سے پوچھا تو آپ نے فرمایا امام رازی نے اسرار المتزئیل میں اس آیت کے تحت یہ تفسیر کی ہے اور اس کا ذکر امام جلال الدین سیوطی نے اپنے رسالہ التنظيم والمنته میں کیا ہے۔ اور ہم اس مسئلہ کو ظنی طور پر مانتے ہیں اور شیعہ حضرات اس کو اصول سے مانتے ہیں۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس مسئلہ کے اعتقاد ہی ہونے کا انکار کیا ہے اور اسرار المتزئیل میں اس کے ظنی ہونے کا اثبات کیا ہے۔

## نجدی قاضی سے گفتگو

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب حرم رسول میں حاضر تھے۔ پرسوز گزارشات اور التجائیں کر رہے تھے۔ چہرہ حضور ﷺ کی طرف اور پیچھے کعبہ کی جانب تھی۔ نجدی پہرہ داروں نے منع کیا اور کہا کہ کعبہ کی طرف پیچھے نہ کرو۔ بلکہ کعبہ کی طرف منہ کر کے حضور ﷺ کی طرف پیچھے کر لو۔ آپ نے ان کے انکار کی طرف ذرا التفات نہ کیا۔ دوسرے



دن آپ کو قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ قاضی صاحب نے پوچھا، کیا آپ قبر رسول کو کعبہ سے افضل سمجھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ تم کعبہ کی بات کرتے ہو، میں تو اس جگہ کو عرش سے بھی افضل جانتا ہوں۔ اس نے پوچھا، کوئی دلیل؟ آپ نے فرمایا، دیکھو، از روئے قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ”كَيْسٌ شَكَرْتُمْ لَا زِيَادَتُكُمْ“ وہاں بھی شکر گزار ار ہے۔ اب چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور بلندی پر لے جاتا۔ یہاں تک کہ عرش پر لے جاتا لیکن اللہ تعالیٰ انہیں حضور ﷺ کے پہلو میں لائے گا۔ معلوم ہوا کہ جو عظمت اور بلندی جو ارمسٹیفی میں ہے، وہ عرش کو بھی حاصل نہیں ہے۔ حضرت کاظمی صاحب نے جب یہ دلیل قائم کی تو نجدی قاضی دم بخود رہ گیا۔

WWW.KAZIMIS.COM

WWW.KAZIMIS.COM



# توحید اور شرک

## خدا کی وحدانیت

☆ اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ہے، اس کا موجود ہونا اور ایک ہونا ایسا ہے کہ جاہلیت زدہ لوگوں کو اس کی تفصیل کی ضرورت ہوتی ہو، ورنہ اس دور میں سلیم الفطرت انسان کے لئے محض اس مسئلہ کی طرف توجہ دلانا ہی کافی ہے۔

☆ عربی کا مشہور مقلد ہے ”الاشیاء تعرف باضدادھا“ یعنی ہر چیز اپنی ضد کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے، مثلاً راحت کا ادراک وہی کر سکتا ہے جو کبھی پریشان ہوا ہو، جس نے کبھی رنج و غم نہ پایا ہو وہ راحت کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ دن کا اندازہ رات کے بغیر نہیں لگایا جاسکتا، اسی طرح ظلمت کے بغیر نور کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور یہی وجہ ہے کہ باطل کا تصور اگر کسی کے سامنے نہ ہو تو وہ حق کی لذتوں سے آشنا نہیں ہو سکتا، اسی طرح جو یہ نہ سمجھے کہ شرک کسے کہتے ہیں، وہ تو حید کو نہیں جان سکتا، جس طرح حق کی پہچان باطل کے تصور سے ہوتی ہے، اسی طرح قیقا تو حید کا صحیح ادراک بھی تب ہوگا جب ہم سمجھیں کہ شرک کسے کہتے ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے تو حید اور شرک کے حالات کو واضح طور پر بیان کیا اور لادینی کے تمام تصورات کو مٹا دیا، لیکن تعجب ہے کہ قرآن کریم کی تصریحات کے باوجود بھی مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا، لیکن یہ چیز الجھی ہوئی ان ہی لوگوں کے لئے ہے جن کے ذہن الجھے ہوئے ہیں۔

## توحید کا معنی

☆ تو حید کا معنی ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو اس کی ذات اور صفات میں شریک سے پاک ماننا، یعنی جیسا اللہ ہے ویسا ہم کسی کو اللہ نہ مانیں، اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو اللہ تصور کرتا ہے تو وہ ذات میں شرک کرتا ہے۔

☆ علم، سمع، بصر وغیرہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اگر ان صفات میں کسی دوسرے کو شریک ٹھہرائیں تو ہم شرک ہوں گے۔

## توحید اور شرک میں فرق

☆ ہمیں تو حید کا معنی معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

☆ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”علم“ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اگر ہم کسی دوسرے کے لئے علم ثابت کریں تو کیا یہ شرک ہوگا؟ سمع و بصر اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، اگر ہم کسی دوسرے کے لئے سننے اور دیکھنے کی صفات ثابت کر دیں تو کیا یہ بھی شرک ہوگا؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے صفت حیات ثابت ہے، اگر ہم کسی دوسرے کو حیات کی صفت کا حامل کہیں تو کیا ہم شرک ہوں گے؟

☆ اللہ تعالیٰ کی حیات اور انسانی حیات۔ اللہ تعالیٰ کی حیات پوری سب کا ایمان ہے اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صفت حیات دی ہے وہ سب اس صفت کے حامل ہیں، پس ہم نے اپنے لئے بھی حیات کی صفت کو جانا اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی صفت حیات کو مانا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو حیات ہم اللہ تعالیٰ کے لئے مانتے ہیں وہ حیات نہ ہم اپنے لئے مانتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی دینے والا ہے، اللہ تعالیٰ کو کوئی حیات دینے والا نہیں، ہماری حیات عارضی ہے اس کی دی ہوئی ہے، محدود اور فانی ہے، اللہ تعالیٰ کی حیات عارضی نہیں، عطائی نہیں اور محدود بھی نہیں، پس جب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حیات باقی ہے اور ہماری فانی، تو شرک ختم ہو گیا، یہی تصورات تمام مسائل میں پیش کرتے چلے جائیں بات واضح ہو جاتی ہے۔

## قدرت خداوندی اور اختیار انسانی

☆ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر کوئی قوت پیدا نہیں کی؟ اگر نہیں کی تو پھر پتھر اور انسان میں کیا فرق ہوگا؟

☆ اللہ تعالیٰ قادر و مختار ہے اور انسان کی وہ قدرت اور اختیار جو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اندر پیدا کی، اس کی وجہ سے انسان بھی مختار ہوا کہ نہیں؟ تو پھر اللہ تعالیٰ بھی مختار اور بندہ بھی مختار، یہ کیا ہوا؟ سنئے اللہ تعالیٰ مختار ہونے میں محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ کو اختیار کسی سے عطا نہیں ہوا بلکہ ذاتی ہے اور بندہ مختار ہونے میں محتاج ہے۔

## علم ایزدی اور علم انسانی



☆ علم انسانیت کا زیور ہے، لیکن علم تو خدا کی صفت ہے، تو کیا یہ شرک ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو علم اللہ تعالیٰ کا ہے وہ بندے کا نہیں، اللہ تعالیٰ کا علم اپنا ہے، اور ہمارا علم اسی کا عطا کردہ ہے۔

☆ اسی طرح اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے اور فرماتا ہے ہم نے انسان کو سمیع و بصیر یعنی سننے اور دیکھنے والا بنایا، تو اللہ تعالیٰ کی یہ تمام صفات بے نیاز و غنی ہو کر ہیں اور بندوں کی یہ صفات اُس کے حاجت مند اور نیاز مند ہو کر ہیں، کیونکہ انہیں یہ صفات رب نے دیں اور وہ خود اور اس کی صفات رب کے قبضہ اور قدرت میں ہیں، الوہیت اور عبدیت کے درمیان یہی فرق ہے۔

☆ اب شرک کا مطلب واضح ہو گیا کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کی اپنی ہیں یعنی کسی کی عطا کردہ نہیں، وہی کسی اور کے لئے ثابت کرنا شرک ہے، اور ان صفات سے شرک لازم نہیں آتا جو اللہ تعالیٰ نے کسی کو بخشی ہیں، اگر انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے صفات نہ بخشی ہوں تو پھر نہ کوئی سننے والا ہو، نہ دیکھنے والا، نہ زندہ ہو، نہ کوئی علم والا ہو، پس ہم یہی کہیں گے کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ بندے کی نہیں ہو سکتیں، اللہ تعالیٰ کی صفات ازلی وابدی ہیں، بندے کی عارضی ہیں، اللہ تعالیٰ کے کمالات بغیر کسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اور انسان کے کمالات اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے ہیں۔

☆ اگر ہم کسی کے لئے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت اور اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ اختیار مانیں، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سمیع و بصیر مانیں تو شرک نہیں، کیونکہ جب عطا کا تصور آیا تو شرک کی نشی ہو گئی۔

## ایک سوال

☆ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہو گیا، آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیز کا تصور آ گیا تو شرک ختم ہو گیا، حالانکہ یہ بات نہیں کیونکہ مشرکین بتوں کی پوجا کرتے تھے، اُن سے پوچھا گیا کہ تم جو بتوں کی پوجا کرتے ہو ان کو کس نے پیدا کیا؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وَلَسْنَا لَهُم مِّنْ خَلْقِهِمْ لِيَقُولُوا لَئِنْ يَدْعُونَ فَكُونُوا“ (سورۃ زخرف، آیت ۸۷) ترجمہ اور اگر اے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے پھر وہ کہاں اونڈھے بہکے جاتے ہیں۔

☆ معلوم ہوا کہ صرف اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے تصور کو مان لینے سے مقصد پورا نہ ہوا اور محض مخلوق کا تصور کرنا شرک سے بچنے کے لئے کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص صفات میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرانا اور یہ ماننا کہ خدا کی ہر صفت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، بھی ضروری ہے۔

☆ مشرکین کا اعتقاد یہ درست ہے کہ مشرکوں نے اپنے باطل معبودوں کو مخلوق مانا، لیکن جب مان لیا تو ان کو تسلیم کرنا چاہیے تھا کہ مخلوق خالق کی محتاج ہے اور خالق کے وجود کے بغیر مخلوق کا وجود نہیں ہو سکتا اور مخلوق جس طرح پیدائش میں خالق کی محتاج ہے اسی طرح موت کے لئے بھی اسی کی محتاج ہے، یہ اعتقاد ضروری تھا لیکن ان مشرکین نے کہا! یہ ٹھیک ہے کہ ان کو اللہ نے پیدا کیا لیکن پیدا کرنے کے بعد ان کو الوہیت دے دی، لہذا اب اللہ تعالیٰ کوئی کام نہ کرے اور یہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اب ان کو اپنے حکم میں نہیں رکھا اور استقلال کی صفت ان کو دے دی کہ میرا حکم نہ بھی ہو تو تم کام کر سکتے ہو، یہ تھا ان جابلوں کا اعتقاد، حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیے تھا کہ جو چیز مخلوق ہے وہ مستقل نہیں ہو سکتی۔

## الوہیت عطائی نہیں ہو سکتی

☆ اللہ تعالیٰ سب کچھ دے سکتا ہے مگر الوہیت نہیں دے سکتا، کیوں کہ الوہیت مستقل ہے اور عطائی چیز مستقل نہیں ہو سکتی، الوہیت استقلال ہی کے معنی میں ہے، لیکن مشرکین کا تصور یہ تھا کہ، انہوں نے کہا کہ لات و منات وغیرہ ایسے زاہد و عابد لوگ تھے کہ اللہ نے کہا تمہاری عبادت کمال کو پہنچ گئی، اب میں تم پر یہ عنایت کرتا ہوں کہ تم آزاد ہو، میں تم پر نہ کچھ فرض کرتا ہوں اور نہ کوئی پابندی لگاتا ہوں، پس اس طرح انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے تمام معبودوں کو الوہیت دے دی۔

☆ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو وصف الوہیت عطا فرما دیا ہے، وہ شرک اور طغ ہے، مشرکین اور مومنین کے مابین بنیادی فرق یہی ہے کہ وہ غیر اللہ کے لئے عطائے الوہیت کے قائل تھے اور مومنین کسی مقرب سے مقرب ترین حتیٰ کہ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی الوہیت اور غنائے ذاتی کے قائل نہیں۔



## ہر کام باذن اللہ عین توحید ہے

☆ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

☆ ”من ذالذی یشفع عنده الا باذنہ“ (ترجمہ) کون ہے جو شفاعت کرے بغیر اذن خداوندی کے۔ پتہ چلا کہ بغیر اذن خداوندی کے شفاعت کا اعتقاد شرک ہے، اور اذن کے ساتھ عین توحید ہے، پس جب یہ عقیدہ آیا کہ فلاں شخص اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی حاجت پوری کر سکتا ہے تو شرک ہے اور جب اذن الہی کا عقیدہ آیا تو شرک ختم۔

## حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کا زندہ کرنا

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کے سامنے تعلیم رسالت پیش کی تو انہوں نے کہا!

وما أنبری الا کمہ والابرص واحی الموتی باذن اللہ (سورہ آل عمران، آیت ۴۹)

ترجمہ۔ اور اچھا کرنا ہوں اندھے اور کوڑھی کو اور مردے کو زندہ کرنا ہوں اللہ کے حکم سے۔

☆ اب دیکھئے شفاء دینا اور مردے کو زندہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، اس لحاظ سے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کاموں کا دعویٰ کیا، لیکن آپ آگے فرماتے ہیں ”باذن اللہ“ یعنی میں جو کچھ کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے اذن سے کرتا ہوں، پس جہاں اذن الہی آجائے تو شرک چلا جاتا ہے اور جہاں اذن لایا تو حید بھی گئی، یہی اذن الہی ہونا اور نہ ہونا تو حید اور شرک کا بنیادی نکتہ ہے۔

## ایک شبہ کا ازالہ

☆ اگر آج کوئی یہ کہے کہ میں مادرزاد اندھوں کو اللہ کے اذن سے اچھا کر دوں گا اور حالانکہ اسے اذن نہیں دیا گیا، تو اس کا یہ کہنا شرک تو نہ ہوگا کیوں کہ اُس نے خود اچھا کرنے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ باذن اللہ کہا، لیکن بغیر اذن کے اذن کہنا اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنا ہے، اور یہ خدا پر بہتان باندھنے والا جھوٹا کہلا سکتا ہے، اسے ہم کافرو کہہ سکتے ہیں لیکن شرک نہیں کہہ سکتے۔

☆ اب اگر کوئی اولیاء اللہ کو باذن اللہ حاجت روا کہے تو شرک تو ختم ہو گیا، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے ان کو اذن دیا ہے؟ اگر اذن دیا تو اس کی کیا دلیل ہے؟

☆ اس سوال میں شرکین تو دونوں طرح سے پٹ گئے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر بتوں کو حاجت روا مانا، دوسرا یہ کہ اگر وہ اذن کے ساتھ حاجت روا مانے بھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اذن دیا نہ تھا تو اس طرح بھی پٹ گئے، ایک تو یہ کہ وہ حاجت روائی کے اہل نہ تھے اور ان کو حاجت روا مانا، دوسرا یہ کہ اذن الہی کا محتاج بھی نہ مانا، پس وہ کفر میں بھی مبتلا ہوئے اور شرک میں بھی۔

☆ اب آئیے مومنین کی طرف کہ وہ شرک سے پاک ہیں کہ ان کے پاس باذن اللہ کا ثبوت ہے اور وہ باذن اللہ حاجت روا مانے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی اللہ نے ان کو اذن دیا ہے؟ اب خطرہ یہ ہے کہ ان پر کفر ثابت نہ ہو جائے، کیونکہ کفر بھی تو مصیبت ہے، ہم نے یہ بتانا ہے کہ ہمارے اعتقاد میں نہ شرک کا شائبہ ہے اور نہ ہی کفر کا۔

☆ لیکن اس سے پہلے ایک بنیادی بات کہہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو شرف انسانیت عطا فرمایا ہے، اس کے متعلق چند چیزیں قرآن و حدیث کی روشنی میں سامنے لائیں تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

## مقصد تخلیق انسان

☆ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو کسی نہ کسی کام کے لئے پیدا کیا ہے، سورج اپنا کام کرتا ہے، درخت اپنا کام کرتے ہیں، پانی، ہوا اپنا کام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا، اس کا بھی تو کوئی کام ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا!

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون۔



ترجمہ۔ ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لئے ہی پیدا کیا۔

☆ عبادت تب ہوتی ہے جب معرفت ہو، پس اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا، اب خدا کی معرفت کا مفاد کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو کوئی جس قدر پہچانتا جائے گا۔ یعنی جتنی معرفت ہوتی جائے گی اسی قدر اللہ کا قرب اس کے نزدیک بڑھتا جائے گا، معلوم ہوا کہ انسان کا مقصد حیات خدا کی معرفت ہے، اور معرفت کا نتیجہ قرب ہے، تو یوں کہنے کے قرب الہی انسانیت کا کمال ہوا، اب اس کمال کو ذرا تفصیل کی روشنی میں دیکھیں تو تمام مسائل حل ہو جائیں۔ آئیے اس قرب کے مفہوم قرب کے انجام اور قرب کے معنی کو دلائل شرعیہ میں تلاش کریں۔

حدیث قدسی

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ قال من عادنی لی ولما فقد اذنتہ بالعرب وما تقرب الی عبدی بشئ احب الی مما افرطت علیہ وما یزال عبدی یتقرب الی ہاتھ اقل حتی احبہ فاذا احبہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یرہ بہ و یدہ الی یطش بہا ورجلہ الی یمشی بہا وان سألنی لا عطفہ و لئن استعاضنی لا عید نہ۔“

(بخاری شریف، مطبوعہ بیانی، جلد ۲، ص ۹۶۲۔ مشکوٰۃ، مطبوعہ مجیدی کانیور، کتاب الدعوات، جلد ۱)

☆ ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے (اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر) فرمایا کہ جس نے میرے ولی سے عداوت کی میرا اس سے اعلان جنگ ہے اور جن چیزوں کے ذریعے بندہ مجھ سے نزدیک ہوتا ہے، ان میں سب سے زیادہ محبوب چیز میرے نزدیک فرائض ہیں اور میرا بندہ فوافل کے ذریعہ میری طرف ہمیشہ نزدیکی حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو جب میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگ کر کسی بُری چیز سے بچنا چاہے تو میں اسے ضرور بچاتا ہوں۔“

☆ بعض لوگ اس حدیث کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر کے اس کا محبوب بن جاتا ہے تو پھر اس کے بعد وہ اپنے کانوں سے کوئی ناجائز بات نہیں سنتا، اپنی آنکھوں سے خلاف حکم شرع کوئی چیز نہیں دیکھتا، اپنے ہاتھ پاؤں سے خلاف شرع کوئی کام نہیں کرتا۔

☆ حدیث کے یہ معنی بالکل غلط ہیں اور یہ حدیث شریف میں تحریف کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ اس معنی سے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے نزدیکی حاصل کرنے والا بندہ محبوب ہونے کے بعد اپنے کسی عضو یا حصہ سے گناہ نہیں کرتا اور اپنے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں سے جو کام کرتا ہے وہ سب جائز اور شرع کے مطابق ہوتے ہیں، لیکن اس معنی کو جب الفاظ حدیث پر پیش کیا جاتا ہے تو حدیث شریف کا کوئی لفظ اس کی تائید نہیں کرتا، کیونکہ ایک معمولی سمجھ والا انسان بھی اس بات کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ گناہوں سے بچنے کی وجہ سے تو وہ محبوب بنا، اگر گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی محبوبیت کا مقام حاصل ہو سکتا ہے تو تقویٰ اور پرہیز گاری کی تو پھر ضرورت ہی نہیں رہتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

قل ان کسم لعلون اللہ فالبعونی بحبکم اللہ

ترجمہ۔ آپ فرمائیے (انہیں کہ) اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ۔

☆ معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع یعنی تقویٰ اور پرہیز گاری کے بغیر مقام محبوبیت خداوندی کا حصول ناممکن ہے۔

☆ بندہ پہلے بُرے کاموں کو چھوڑتا ہے، اُن سے توبہ کرتا ہے، فرائض و فوافل ادا کرتا ہے، تب وہ محبوب ہو جاتا ہے، محبوب ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس بندے کے کان ہو جاتا ہے، جس سے پھر وہ سنتا ہے، اللہ اس کی آنکھ ہو جاتا ہے، جس سے وہ دیکھتا ہے، اللہ اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے، جس سے وہ پکڑتا ہے، اللہ اس کے پاؤں ہو جاتا ہے، جس سے وہ چلتا ہے، یہ سب کچھ محبوب بننے کے بعد ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ بندہ بُرے کام بھی کرے اور محبوب بھی بن جائے اور بعد میں بُرے کام

چھوڑے۔ [۱]

☆ تو بندہ جب اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت سمع، بصر اور قدرت کے انوار، بندے کی سمع، بصر اور قدرت میں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اس



طرح یہ مقرب بندہ صفات الہیہ کا مظہر بن جاتا ہے، یعنی یہ بندہ اللہ تعالیٰ کے نور سمیع سے سنتا ہے، اسی کے نور بصر سے دیکھتا ہے اور اسی کے نور قدرت سے تصرف کرتا ہے، نہ خدا بندے میں حلول کرتا ہے اور نہ خدا ہو جاتا ہے، بلکہ خدا کا یہ مقرب بندہ مظہر خدا ہو کر کمال انسانیت کے اس مرتبہ پر فائز ہوتا ہے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی تھی، اگر آپ غور فرمائیں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ آیت کریمہ ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون“ کے معنی یہی ہیں جن کا صداق یہ عبد مقرب ہے، عبادت کے معنی پامالی کے ہیں، عبد مقرب اپنی انسانیت اور صفات بشریت کو اپنے رب کی بارگاہ میں پامال یعنی ریاضت و مجاہدہ کے ذریعے ان کو فنا کر دیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بندے میں اس کی اپنی صفات عبدیت کی بجائے صفات حق متعالی ہوتی ہیں اور انوار صفات الہیہ سے وہ بندہ منور ہو جاتا ہے، جب قرآن سے ثابت ہے کہ درخت سے ”انی انا اللہ“ کی آواز آسکتی ہے تو عبد مقرب کے لئے کیونکر محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سمیع و بصر کا مظہر نہ ہو سکے۔

☆ علامہ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث قدسی کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں!

”و كذلك العبد اذا اظرب على الطاعات بلغ الى المقام الذي يقول الله كنت له سمعاً وبصراً اذا صار نور جلال الله سمعاً له سمع القريب والباعد واذا صار ذلك النور بدا له قدر على التصرف في الصعب والسهل وابعد والقريب انتهى“ [۴]

ترجمہ۔ ”اور اسی طرح جب کوئی بندہ نیکیوں پر پختگی اختیار کر لیتا ہے تو اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ”كنت له سمعاً وبصراً“ فرمایا ہے، جب اللہ کے جلال کا نور اس کی سمیع ہو جاتا ہے تو وہ دور و نزدیک کی آوازوں کو سن لیتا ہے اور جب یہی نور اس کی بصر ہو گیا تو وہ دور و نزدیک کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے اور جب یہی نور بکمال اس کا ہاتھ ہو جائے تو یہ بندہ مشکل اور آسان، دور اور قریب چیزوں میں تصرف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔“

☆ حدیث قدسی کی شرح میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مقرب بندہ کی شان میں جو کچھ لکھا ہے وہ عبد اور مشرک سمجھتے ہوئے لکھا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اس طرح ان صفات عالیہ کا اس بندہ کے لئے ماننا اس کی عبدیت اور بشریت کے منافی نہیں۔

☆ یہ انسانیت کا کمال ہے کہ بندہ صفات خداوندی کا مظہر ہو جائے، جب اللہ تعالیٰ کی صفت سمیع کی تجلیاں اس کی سمیع میں چمکنے لگیں گی تو یہ ہر قریب و بعید کی آواز کو سن لے گا۔ یہ اس کی ذاتی صفت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تجلی کا عمل ہے، عکس ہے اور پرتو ہے، پرتو اور عمل غیر مستقل ہوتا ہے اور پرتو والا مستقل ہوتا ہے۔ پس اصل تو حید تو یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا اتنا قرب حاصل کرے کہ خدا کی صفات کا آئینہ بن جائے۔

☆ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بصر کا نور جب اس کی بصر کے مستقل شدہ آئینے میں چمکے گا تو وہ ہر نزدیک اور دور کی چیز کو دیکھ لے گا۔

☆ جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نور کے جلوے اس کے ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ میں ظاہر ہوں گے تو یہ ہر آسان ہر مشکل اور ہر دور و نزدیک کی چیز پر قادر ہو جائے گا، اب بتائیے کہ جب مشکل بندے کی قدرت میں ہوگی تو مشکل کشا نہیں تو اور کیا ہے؟

☆ مگر خوب یاد رکھیے کہ خدا کا مشکل کشا ہونا ذاتی ہے اور بندے کا مشکل کشا ہونا عطائی ہے کیونکہ بندہ اگر کسی کی کوئی مشکل حل کرتا ہے یا حاجت پوری کرتا ہے تو اللہ کی دی ہوئی طاقت و اختیار سے کرتا ہے اور اللہ اذن سے کرتا ہے۔

☆ پس واضح ہو گیا کہ ہمارا یہ عقیدہ مشرک کی تمام جڑوں کو کاٹنے والا ہے، اب بتائیے کہ عین تو حید کو لوگ مشرک کہتے ہیں تو اسلام پھر کیا ہوگا؟

☆ پس یہ اور اک، علم سمیع اور بصر جو ان مقربین بارگاہ الہی میں پائے جاتے ہیں اور جن میں دلیل موجود ہے، ان میں آسان سے آسان کام پر بھی اطمینان اللہ کی قدرت ثابت ہوگی اور مشکل و بعید چیزوں پر بھی ان کی قدرت ثابت ہوگی اور یہ دلیل قائم ہوگی کہ یہ نفع پہنچانے والے ہیں اور بارگاہ رب العالمین میں دعائیں کر کے رب کو راضی کرنے کی صلاحیتیں رکھنے والے ہیں، ان میں مشکل کشائی کی قدرتیں بھی ہیں، دور سے دیکھنے کی قدرتیں بھی ہیں اور بعید کی آواز کو بھی سن سکتے ہیں۔

☆ کفار مکہ تو خدا پر یہ بہتان باندھتے تھے کہ خدا نے ان پتھروں اور بتوں کو اختیار دے رکھا ہے اور اذن دے دیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا، اور جب ہم نے ان انبیاء و اولیاء پر اذن کی شرط لگائی تو مشرک دور ہو گیا اور جب ان کے اختیار کو ثابت کر دیا تو کفر بھی جاتا رہا۔

☆ الحمد للہ، ہم باذن اللہ کا اعتقاد کر کے مشرک سے پاک اور انبیاء و اولیاء کے اختیارات ثابت کر کے کفر سے بھی پاک ہیں۔



☆ بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ جو آیات قرآنی بتوں کے حق میں آئی ہیں، اُن کو مومنوں پر چسپاں کرتے ہیں اور اس طرح بھولے بھالے مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

☆ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما خارجی گروہ کو ساری مخلوق سے بُرا جانتے تھے اور فرمایا ان لوگوں نے اپنا طریقہ یہ بتالیا ہے کہ جو آیات کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئیں ہیں ان کو مومنوں پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ [۳]

☆ کسی محترم دوست نے ایک سوال پوچھا ہے، مناسب ہے کہ اس کے متعلق چند جملے عرض کروں تا کہ سابقہ مضمون نامکمل نہ رہے۔

☆ سوال کمال انسانیت کا جو معیار کتاب و سنت کی روشنی میں ہمارے سامنے آیا وہ ٹھیک ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات آئینہ اور مظہر تجلیات ربانی بن جائے، یہ بات زندگی میں تو ممکن ہے، لیکن مرنے کے بعد تو وہ صرف مٹی کا ایک ڈھیر ہے، اس وقت اس کے کمالات کا اعتراف کرنا کہاں مناسب ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک مور و تجلیات الہی ہے اور ابھی تک انسان کامل ہے، مرنے کے بعد تو یہ بات ختم ہو جانی چاہیے، ان کا سننا، دیکھنا، قریب و بعید کی آواز سننا، نزدیک و دور کی اشیاء کو دیکھنا اور ان پر قدرت رکھنا اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا مظہر قرار پانا ختم ہو جانا چاہیے، کیونکہ جب موت آئی تو تمام کمالات ختم ہو گئے۔

☆ جواب۔ یہ بات ذہن میں اس لئے پیدا ہوئی کہ ہم نے انسانیت کے مفہوم کو نہ سمجھا، ہم نے خیال کیا کہ یہ گوشت اور پوست ہی انسان ہے۔

☆ یہ غلط ہے، یاد رکھیے کہ یہ مفہوم انسانیت، حقیقت انسانیت نہیں، حقیقت انسانیت وہ چیز ہے جو مرنے کے بعد بھی زندہ اور باقی رہتی ہے، یہ جسم اور روح جن کا مجموعہ ہمیں انسان نظر آتا ہے، ان دونوں میں جو اصل حقیقت ہے وہ روح ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ جسم تو گل سڑ جاتا ہے، اگر جسم کو اصل حقیقت قرار دے دیا جائے تو پھر یہ تو مرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ اصل حقیقت تو روح ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قبر جنت کا باغ ہے یا جہنم کا گڑھا ہے۔ [۴] وہ جنت کا باغ اور دوزخ کا گڑھا کس کے لئے ہے؟ یقیناً کبھی اسی روح کے لئے ہے، اجزائے جسمانی چاہے کھڑے ہوئے ہوں یا اکٹھے ہوں، ان کا تعلق روح سے اس طرح ہوتا ہے جیسے سورج کا تعلق اشیاء ہے، اگر کہیں ریت کا ڈھیر پڑا ہو یا سنگلاخ زمین ہو یا گرد و غبار فضا میں ہو تو بھی سورج کی کرنوں کا تعلق اُس سے ہے، اسی طرح جسم کے اجزاء پر روح کی شعاعیں پڑتی ہیں، تو مرنے کے بعد بھی روح کا تعلق اس سالم بدن یا جسم کے متفرق اجزاء سے ضرور ہوگا، البتہ روح کا تعلق جو بدن سے اب ہے وہ تعلق مرنے کے بعد اور روح کے بدن سے نکل جانے کے بعد بدل جائے گا۔

☆ پس اصل حقیقت روح ہے جو آفتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور جسم فانی ہے، ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد پھٹ جائے گا، منتشر ہو جائے گا، تو اس کا نظام بھی فانی ہے، ایک مرتبہ کھانا کھایا پھر ضرورت ہوگی، جسم کا کمال بھی فانی ہے، کئی طاقت و انسان پیدا ہوئے لیکن جب موت آئی تو اُن کی انگلی بھی نہیں ہلتی، لیکن روح باقی ہے تو اس کی صفات بھی باقی ہیں اور اس کے کمالات بھی باقی ہیں۔

☆ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ روح بخیر و آفتاب کے ہے، روح اگر خوش ہے تو جسم کے اجزاء پر اچھے اثرات دے گی اور اگر روح ناخوش ہے تو اچانک اور ناخوش اثر دے گی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قبر میں کوئی گرمی یا عذاب نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی قبر میں کوئی باغ وغیرہ نظر آتا ہے۔

☆ تو اس کا جواب یہ ہے کہ روح اگر خوش ہے تو بدن پر خوشی کے اثرات وقف کرے گی اور اگر تکلیف میں ہے تو بدن پر تکلیف کے اثرات چھوڑے گی، لیکن وہ خوشی یا تکلیف کے اثرات عالم برزخ میں ہوں گے اور کسی کو نظر نہیں آئیں گے، مثلاً کسی کے ذہن میں غمی یا خوشی کے اثرات ہیں یا کسی کے سر میں درد ہے تو اس کے سر کے عالم کو آپ کس طرح جان سکیں گے؟ درد والے سر پر آپ ہاتھ رکھ دیں یا لاکھ آلات لگائے جائیں تو کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ سر کے اندر درد ہے یا نہیں؟ ہلکا درد ہے یا تیز درد ہے؟، یہ تو اُسی کو پتہ ہے جس کو درد ہے، اسی طرح قبر میں جو مرد دھما مردے کے اجزاء پڑے ہیں مرقینا ان پر روح نے راحت یا رنج کے اثرات چھوڑے ہیں، مگر وہ ہمیں معلوم نہیں ہوتے، مردے کی تکلیف کا اثر مردے کے اجزاء ہی کو محسوس ہوگا نہ کہ زمین کو جس پر وہ اجزاء پڑے ہیں۔

☆ ایک شخص عالم خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کے مکان کو آگ لگ گئی ہے، اس کی چارپائی جل رہی ہے، وہ خود جل رہا ہے، چیخ رہا ہے، آپ اس کو دیکھیں تو کیا آپ کو اس کی چارپائی جلتی ہوئی نظر آئے گی؟ یقیناً نہیں تو اسی طرح عالم برزخ میں کافروں کو عذاب ہوتا ہے مگر ہمیں قبر کے اندر عذاب گرمی اور آگ معلوم نہیں ہوتی۔

**فصل قبر**



☆ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مرنے کے بعد جب انسان کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو قبر تک ہو جاتی ہے، مومن ہوا اس کو بھی دباتی ہے اور کافر ہوا اس کو بھی دباتی ہے، مومن کو قبر کیوں دباتی ہے؟ یہ اس لئے کہ قبر تو آغوشِ مادر ہے، قبر کی آغوش میں مردہ ایسے ہے جیسے ماں کی گود میں بچہ، اُم، ماں کو کہتے ہیں اور اصل کو بھی کہتے ہیں، بچے کی اصل ماں ہے، اسی طرح تمام بنی آدم کی اصل زمین ہے اور اصل ماں ہوتی ہے، پس ہم پیدا ہوئے اور اپنے احوال میں مبتلا ہو گئے اور یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے اور آغوشِ مادر کا زمانہ ختم ہونے پر وہاں زارِ گلیوں میں جاتا ہے، اگر بچہ اچھا ہے اور ماں اس کی خصلتوں سے خوش ہے، اس صورت میں ماں خطر رہے گی کہ کب میرا بچہ آئے، میرے سینے سے لگے اور میرے دل کو ٹھنڈا کرے، لیکن ایک بچہ بُرا ہے اس صورت میں ماں اس سے چلی بیٹھی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ آئے اور میں اس کو سزا دوں، اسی طرح قبر ہر بنی آدم کے لئے خطر ہے۔

☆ ماں جب بچہ کو آغوش میں دبا کر پیار کرتی ہے وہ اس بچہ کو کچھ نہ کچھ تکلیف تو ضرور ہوتی ہے لیکن بچہ اس تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتا، پس قبر جب مومن کو دباتی ہے تو مومن کو وہ تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

☆ معلوم ہوا کہ اگر روح کو فانی قرار دیں تو یوں سمجھئے کہ قبر کا عذاب اور ثواب سب کچھ ختم اور حساب کتاب بھی نہ ہو اور پھر حشر نشر کیسا؟ کیوں کہ ثواب و عذاب تو روح کے لئے ہے، اگر روح کو فانی مان لیں تو سارا دین ختم ہو کر رہ جائے گا۔

☆ ہم نے ثابت کر دیا کہ روح باقی ہے اور حسبِ روح باقی ہے تو حقیقتِ انسانیت اسی روح کا نام ہے، اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں دیں، جسم اور روح، ان میں جسم فانی ہے اور روح باقی ہے، پس فانی کے اثرات اور وصف بھی فانی، کیونکہ موصوف فانی ہوتا اس کی صفات بھی فانی ہوتی ہیں، لہذا بدن فانی تو بدن کے سب کمالات بھی فانی ہیں۔

☆ اب بتائیے کہ مظہر تجلیاتِ صفاتِ الہی اور آئینہ جمالِ رب ہوتا یہ صفتِ روح کی ہے یا جسم کی؟ یقیناً یہ روح کی صفت ہے، تو معلوم ہوا کہ موصوف جب باقی ہے تو اس کی صفت بھی باقی ہوگی، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ نیکی کے کام ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اللہ کا ذکر ہے، یہ روح کی فضا ہے تو کیا مرنے کے بعد ایمان، نماز اور دوسری نیکیاں ختم ہو جائیں گی یا باقی رہیں گی؟ یقیناً باقی رہیں گی، تو بھائی مرنے کے بعد تمہاری تمام روحانی صفات باقی رہیں اور ولی کے مرنے کے بعد اُس کے تمام روحانی کمالات ختم ہو جائیں، یہ عجیب بات ہے، پس ان حضرات کی قبور کے اندر بھی روحانیت زندہ ہوتی ہے اور روحانی کمالات بھی باقی ہوتے ہیں۔

## عہد رسالت کا واقعہ

☆ ترمذی شریف کی حدیث ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صحابی رسول نے ایک قبر پر اپنا خیمہ نصب کیا لیکن اس کو اس جگہ قبر ہونے کا علم نہ تھا، کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ یہاں کسی انسان کی قبر ہے اور اس میں سے سورہ ملک (پ ۲۹) پڑھنے کی آواز آرہی ہے، جب وہ صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تمام واقعہ بیان کیا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سورہ ملک روکنے والی اور نجات دینے والی ہے اپنے پڑھنے والے کو عذابِ قبر سے۔

☆ اگر مرنے کے بعد قبر میں کوئی چیز باقی نہ ہوتی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس صحابی سے فرماتے کہ بھی یہ تمہارا وہم ہے، یا فرماتے کہ کوئی فرشتہ ہو گیا کوئی جنِ تلاوت کر رہا ہوگا، قبر میں مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا، لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا اور کوئی تردید نہیں فرمائی۔

## دورِ صحابہ کا واقعہ

☆ یہ تو عہد رسالت کا واقعہ ہے اب دورِ صحابہ کا واقعہ سنئے!

☆ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں مکہ مدینہ کے درمیان نہر کھودی گئی تو اتفاقاً وہ نہر اسی راستے سے آئی جس میں اُحد کا قبرستان آتا تھا، مزدور کام کر رہے تھے، ایک مزدور نے کھدائی کرتے ہوئے زمین میں پھاڑا مارا تو اتفاقاً وہیں ایک شہید دفن تھا تو وہ پھاڑا اُس کے پاؤں کے انگوٹھے میں جا لگا اور خون جاری ہو گیا۔ [۵]

☆ یہ تو قبر میں حیاتِ جسمانی کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد ان کے جسم میں بھی زندگی موجود ہے اور چہ جائیکہ روح جو ہے ہی باقی۔



## زمانہ تبیین کا واقعہ

☆ امام ابو نعیم "حیلة الاولیاء" میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کی قسم! میں نے اور حید طویل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ثابت بنانی رضی اللہ عنہ [۶] کو قبر میں اتارا تھا، جب ہم کچی اینٹیں برآمد کر چکے تو ایک اینٹ گر گئی، میں نے انہیں دیکھا کہ وہ قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں، وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ اگر تو نے کسی مخلوق کو قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے تو مجھے بھی اجازت فرما، اللہ تعالیٰ کی شان سے بعید تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو رد فرمادے۔ [۷]

☆ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ شعب الایمان میں اپنی سند سے قاضی خیشا پور ابراہیم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک صالح عورت کا انتقال ہو گیا، ایک کفن چوراس کے جنازہ کی نماز میں اس غرض سے شامل ہو گیا تا کہ ساتھ جا کر اس کی قبر کا پتہ لگائے، جب رات ہو گئی تو وہ قبرستان میں گیا اور اُس عورت کی قبر کھود کر کفن کو ہاتھ ڈالا تو وہ خدا کی بندی بول اُٹھی کہ سبحان اللہ ایک جنتی شخص ایک جنتی عورت کا کفن نہ راتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میری اور ان تمام لوگوں کی مغفرت فرمادی جنہوں نے میرے جنازے کی نماز پڑھی اور تو بھی اُن میں شریک تھا، یہ سن کر اُس نے فوراً قبر پر مٹی ڈال دی اور بچے دل سے سنا تب ہو گیا۔ [۸]

☆ ایس ویوں کا تو یہ حال ہے کہ چور جائے اور ولی بن کر آئے سب کوئی کہے کہ مرنے کے بعد اُن کی کوئی روحانی طاقت نہیں تو یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ روح تو اپنے لوازمات کے ساتھ باقی ہے۔

☆ حدیث قدسی میں ہے کہ میرا بندہ جب میرا مقرب ہو تو اس نے اپنے کلام کو میرے کلام کا اور اپنی صفات کو میری صفات کا آئینہ دار بنادیا تو اب مجھ سے کچھ مانگے تو میں اس کو عطا کروں گا، وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں اُسے پناہ دوں گا، یہ سب کمالات اس کی روح کے لئے ہیں اور جب تک روح چلے گی یہ سب باتیں بھی ساتھ چلیں گی، اس حدیث میں وقت کی کوئی قید نہیں مطلب یہ ہے کہ جب مانگے میں ضرور دوں گا، تو اب وہ چاہے دنیا میں مانگیں یا موت کے بعد کے جہان میں مانگیں یا آخرت میں مانگیں وہ مانگ سکتے ہیں اور خدا ضرور دیتا ہے۔

☆ ہم اولیاء اللہ کے مزارات پر اس لئے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ "ان سألنی لا عظیمہ" یعنی اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتے ہیں تو میں ان کو ضرور دیتا ہوں تو کسی مزار پر جا کر یہ کہنا کہ اے اللہ کوئی خدا سے دعا کریں کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو کوئی قباحت نہیں، اب اگر کوئی کہے کہ ولی کے پاس جانے سے کچھ نہیں بنتا تو اس نے ولی کا کچھ نہ بگاڑا بلکہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو جھٹلایا۔

☆ اب بات یہ ہے کہ کسی نے مزار پر جا کر کہا کہ اے اللہ کے ولی یا ذی اللہ دعا کر یہ کام کرو، وہ کام نہ ہوا تو اولیاء اللہ کو برا کہنے لگے، دیکھئے اللہ تعالیٰ تو کسی اذن کا محتاج نہیں وہ فرماتا ہے!

ترجمہ۔ میرے بندو مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا۔ (پ ۲۳)

☆ اب دیکھئے ایک شخص کو پچاسی کا حکم ہو گیا، ادھر تم دعا مانگتے ہو کہ اے اللہ اس کو پچاسی سے بچالے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے تقدیر میرم (نہ ملنے والی تقدیر) میں لکھ دیا تو وہ ضرور پچاسی چڑھے گا، اب خدا کا کچھ بگاڑ کر دکھاؤ، وہ تو فرماتا ہے تم مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا، اب یہاں تم خدا کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تو اولیاء اللہ کا کیا بگاڑو گے وہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اذن کے سوا چلنے ہی نہیں۔

☆ جب زندہ لوگوں میں سے اہل خیر اور صالحین سے دعا کی درخواست جائز ہے، پھر جب یہ حضرات جن سے زندگی میں طلب دعا کرتے تھے، وصال فرما جائیں اور برزخی حیات سے مشرف ہو جائیں تو ان سے اب طلب دعا میں کیا قباحت پیدا ہو جاتی ہے، ان کی بزرگی، ان کا تقرب اور ان کی مبارک روحانیت پر تو موت نہیں آئی، موت تو صرف جسم پر ہے نہ کہ روح پر، وہ تو زندہ ہے، اُس کا شعور و ادراک قوت سماعت اور استجابیت دعا بھی باقی ہے بلکہ ساری کرامتیں باقی ہیں کیونکہ یہ اُس کے روحانی کمالات ہیں اور روح فانی نہیں، اس لئے یہ کمالات بھی فانی نہیں۔

☆ یہ تو تھی عالم دنیا اور عالم برزخ کی بات، اب سوال یہ ہے کہ عالم آخرت میں بھی اولیائے کرام کا فائدہ ہو گا یا نہیں؟۔



☆ دیکھئے اگر انبیاء و اولیاء کے پاس جانا اور ان سے مدد مانگنا شرک ہے تو یہ شرک تو پھر آخرت تک چلے گا، پس معلو ہوا کہ جو یہاں شرک سمجھتے ہیں وہ وہاں بھی نہیں جائیں گے اور جو جائیں گے نہیں تو شفاعت کیسے پائیں گے؟ کرنے والا تو سب کچھ خدا ہے، مگر خداوند کریم اپنے بندوں کا احترام کرتا ہے اور اعزاز بخشتا ہے، جو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ولی کچھ نہیں ہوتے ہیں، سب فراڈ ہے تو وہ بھی من لیس، حدیث قدسی کے شروع ہی میں ہے کہ ”من عاد لی ولیا فقد اذنتہ بالحرہ“، یعنی جس نے



میر سولی سے عداوت کی اُس کے ساتھ میر اعلان جنگ ہے۔

☆ تو دوستو اولیاء کرام نہ خدا کے شریک ہیں نہ ساجھی ہیں و لہذا خدا کے اذن اور حکم کے تابع ہیں، معلوم ہوا کہ ”من دون اللہ“ تو ایک تنہا بھی نہیں ہلا سکا اور ”باذن اللہ“ سے مردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں، اب جو لوگ من دون اللہ کی باتیں باذن اللہ پر چسپاں کرتے ہیں خدا ان کو ہدایت دے۔

☆ اب ایک بات میری نظر میں اٹھنی باقی ہے جو اہل علم طبقہ کے لئے قابل تشریح ہے، وہ یہ کہ جو لوگ اللہ کے مقرنین اور حضرات اولیاء کرام کے تصرفات بعد الوفا اور علم وادراک بعد الحیات کے قائل نہیں اور اس امر کو حید کے منافی سمجھتے ہیں، اُن کی طرف سے علی العموم یہ شبہ پیش کیا جاتا ہے اور اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقہ کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آپ لوگ تو اولیاء اللہ کے علم وادراک بعد الوفا کا عقیدہ رکھتے ہیں، حالانکہ قرآن پاک میں صاف وارد ہے کہ انبیاء کرام کو موت کے بعد کوئی ادراک اور کوئی علم نہیں ہوتا اور جو انبیاء نہیں بلکہ اولیاء ہیں اُن کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کیونکر صحیح ہوگا۔

☆ اس شبہ کو کہ مرنے کے بعد اولیاء اللہ بے خبر ہوتے ہیں قرآن مجید کی ایک آیت سے مؤید کرنے کی کوشش کی گئی ہے، میں اس کا جواب دیتا ہوں، تاکہ اس شبہ کا ازالہ ہو جائے، وہ آیت یہ ہے!

”او کالذی مرّ علی قریۃ وہی خالیۃ علیٰ عروشہا قال انی بحییٰ ہذہ اللہ بعد موتہا فا مائہ اللہ مائہ عام ثم

بعثہ قال کم لبت قال لبت یوماً او بعض یوم قال بل لبت مائہ عام۔ (پ ۳، سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۵۹)

ترجمہ۔ مثل اس شخص کے جو گزرا ایک بستی پر وہ اس حال میں تھی کہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل، کہنے لگا کیوں کر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد، پس حالت موت رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک، پھر زندہ کیا اُسے فرمایا کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا، اُس نے عرض کی میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، اللہ نے فرمایا نہیں بلکہ ٹھہرا رہا ہے تو سو سال۔

☆ اللہ نے کچھ امثال بیان فرمائے، ایک یہ کہ حضرت عزیر علیہ السلام جو ایک دراز کوٹھیا حمار شریف پر سوار ہو کر تشریف لے جا رہے تھے اور کسی ایسے مقام سے گزرے جہاں عمارتیں گر چکی تھیں اور اس بستی کے کھنڈرات پڑے تھے، (مفسرین نے لکھا ہے کہ اس بستی سے مراد بیت المقدس ہے) جب آپ وہاں سے گزرے تو فرمانے لگے اے اللہ! تو ان کے مرنے کے بعد ان کو کس طرح زندہ فرمائے گا اور کس طرح اٹھائے گا، پس اللہ تعالیٰ نے ان کو سو سال تک حالت موت میں رکھا اور پھر ان کو اٹھایا اور فرمایا تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے رہے، انہوں نے جواب دیا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا رہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم تو یہاں سو برس تک ٹھہرے رہے ہو۔

☆ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے رہنے کے جواب میں بتایا اور ثابت کر دیا کہ اُن پر سو برس تک موت طاری رہی، اب شبہ پیدا ہوا کہ اگر اُن کو معلوم ہوتا تو وہ سو برس کی بجائے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ کیوں کہتے؟ پس معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد اُن کو کوئی علم وادراک نہ رہا تھا۔

☆ جس آسان طریقہ سے یہ شبہ بیان کیا جاتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اُسی آسان اور ہلکے طریقہ سے اس شبہ کو دور کر دوں تو سنئے!

☆ سب سے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں حضرت عزیر علیہ السلام کا ذکر نہیں آیا بلکہ فرمایا ”کالذی مرّ علی قریۃ“ (مثل اس شخص کے جو گزرا ایک بستی پر) یہاں ”الذی“ کا لفظ آیا ہے اور ”الذی“ کی تفسیر میں کئی قول آئے ہیں جن میں سے کوئی قول ایسا نہیں جس پر قطعیت کا حکم لگایا جاسکے، (قطعیت سے مراد یہ ہے کہ جس طرح قرآن کا لفظ کفر ہے وہ بھی کفر ہو) ”الذی“ سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک عزیر علیہ السلام ہیں، لیکن یہ قول محض مفسرین کا قول ہے، پس یہاں قطعیت کا حکم نہیں آسکتا، اس کے علاوہ تفسیر میں چند اقوال ہیں جن میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ ”الذی“ سے مراد ایک کافر ہے (تفسیر بیضاوی لہذا اگر ہم اس سے مراد ایک مرد کافر لیں تو اب جہاں ایک قول کافر کے بارے میں آئے وہاں عزیر علیہ السلام کو کیسے لائیں؟ کیونکہ ایسی بات سے قطعی طور پر کسی نئی کو متعین کرنا باطل ہے، لہذا تمہارا یہ قول قابلِ سماعت نہیں۔

☆ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر ”الذی“ سے مراد عزیر علیہ السلام ہیں اور مرنے کے بعد ان کو کوئی علم نہیں تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ جس کو کسی بات کا علم نہ ہو اس سے کسی علم کی بات کا دریافت کرنا کیسے صحیح ہے، جماد، پتھر اور مٹی کے اندر تو کوئی علم نہیں ہوتا اور جب وہ (معاذ اللہ) مٹی پتھر ہیں تو کیا علم کی بات ان سے پوچھا غلط نہیں؟



شاید آپ کہیں کہ خدا کی شان یہ ہے کہ خدا کوئی کام کرے تو خدا کے کام پر کوئی سوال نہیں کر سکتا کہ اللہ نے ایسا کیوں کیا۔

☆ میں عرض کروں گا کہ اگر آیت کا مطلب یہ لے لیا جائے تو خدا تعالیٰ کے کمال حکمت پر دھبہ آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، خدا تعالیٰ سب پر قادر ہے اور قادر ہے، سب کو اپنی قدرت اور احاطہ میں لینے والا ہے، جو چاہے کرے اور جو کرے گا حکمت کے تقاضے سے کرے گا، وہ کسی سے مقہور نہیں ہے، تو جو علم و ادراک نہ رکھتا ہو اس سے علم کی بات پوچھنا حکمت کے تقاضے کے خلاف ہے، اور وہ بات جو حکمت کے تقاضے کے خلاف ہو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنا حماقت ہے، پس یہ سوال اس سے کیا جا رہا ہے جو کل ادراک ہے اور علم رکھتا ہے۔

☆ یہاں دو چیزیں ہیں، مسائل اور مسائل عنہ

☆ مسائل کا سوال ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محل ادراک یعنی ادراک والا ہے، کیونکہ سوال کرنے والا حکمت کے تقاضوں سے دور نہیں، وہ علم و خیر ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم و خیر ہوتا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جس سے سوال فرما رہا ہے وہ علم اور ادراک والا ہے۔

☆ اگر عزیر علیہ السلام کو علم و ادراک نہ ہوتا تو چاہیے تھا کہ وہ خاموش ہو جاتے یا کہتے کہ میں تو مرنے کے بعد مٹی، پتھر اور جماد ہو گیا تھا، میں تو جب بتاؤں کہ مجھے کچھ علم ہو، لیکن وہ کہتے ہیں کہ میرے مولا میں ”یوماً“ اور بعض یوم، یعنی ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا تو پتہ چلا کہ وہ اپنے علم و ادراک کا اعتراف کر رہے ہیں اور اس کے مطابق بیان کر رہے ہیں، پس اللہ تعالیٰ کا سوال ”کم لبثت“ (کتنی دیر ٹھہرے) حکمت کے مطابق ہے، دوسرے یہ کہ اگر ان کو کوئی علم نہ ہوتا تو وہ یہ بات نہ کہتے، یہ دونوں باتیں دلیل ہیں کہ وہ محل ادراک ہیں۔

☆ اب یہاں ایک شبہ پیدا ہو گیا کہ جو بات واقع میں تھی وہی بتاتے، علم معلوم کے مطابق ہونا چاہیے لیکن یہاں ان کا علم تو معلوم کے خلاف ہے اور جو علم معلوم کے خلاف ہو وہاں تو لاعلمی پیدا ہوگئی۔

☆ دیکھئے لوگوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا، جتنی گفتگو میں نے کی ہے اس کا مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو محل ادراک جان کر سوال کیا اور انہوں نے اپنے علم و ادراک کو مان کر جواب دیا، یہ دونوں باتیں ذہن میں رکھ کر یہ بات سمجھئے۔

☆ اب اس جگہ ”یوماً“ اور بعض یوم کی بنا پر شبہ یہ ہے کہ اگر واقعی اُن کو علم تھا تو ”یوماً“ کے بعد ”او“ ہو گیا، اس سے تو شک معلوم ہوتا ہے، لہذا اُن کو شک تھا اور صحیح مدت کا علم نہیں تھا۔

☆ میں کہتا ہوں کہ دیکھئے ”او کالذی مر علی قریۃ“ میں بھی ”او“ موجود ہے اور یہ اللہ کا کلام ہے، اب بتاؤ کیا یہاں بھی ”او“ شک کے لئے متعین ہوگا؟ نہیں، میں عرض کرتا ہوں کہ ”او“ ہمیشہ شک کے لئے نہیں آتا، یہاں ”او“ تاخیر کے لئے ہے، یعنی ”او بعض یوم“ سے مراد یوم تقرر نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ میں اتنی دیر ٹھہرا کہ جو مدت قلیل تھی، اب اے مخاطب تجھ کو اختیار ہے کہ اس مدت قلیل کو ایک دن اندازہ کرے یا ایک دن سے کم، اور یہ دونوں مدت قلیل ہیں، تو معنی یہ ہوئے کہ اے مولا میں تو مدت قلیل ٹھہرا ہوں اب اس کا اندازہ تو ”یوماً“ سے لگا لے یا ”بعض یوم“ سے، معلوم ہوا کہ محض مدت قلیل مراد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ ”او“ اس لحاظ سے استعمال کیا ہے کہ وہاں مخاطب کو اختیار دیا ہے کہ اب تو اس کو اس سے اندازہ کر لے یا اس سے۔

☆ اب آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”بل لبثت ما تہ عام“ (بلکہ تو ٹھہرا رہا ہے سو برس تک) اب پھر سوال پیدا ہو گیا کہ ”عل“ تو ابطال کے لئے آتا ہے، لہذا اللہ تعالیٰ نے ”عل“ کہہ کر عزیر علیہ السلام کے کلام کو باطل کر دیا اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ قلیل مدت باطل ہے اور طویل مدت ”ما تہ عام“ یعنی سو برس صحیح ہے، پس اگر ”ما تہ عام“ صحیح ہے تو ”یوماً“ اور بعض یوم غلط ہے، اور حضرت عزیر علیہ السلام نے مدت قلیل کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ باطل ہے، تو معلوم ہوا کہ اُن کا کلام واقع کے مطابق نہیں ہے، لہذا کذب ہوا، کیونکہ کلام کا واقع کے مطابق ہونا صدق ہے اور کلام کا واقع کے مطابق نہ ہونا کذب ہے۔

☆ اب اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو اُن کا یہ قول باطل ہوا، یعنی واقع کے مطابق نہ ہوا اور یہی کذب ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام نے یہی کیا یعنی واقع کے مطابق نہ بتایا تو ان کا کلام سچا نہ رہا۔



☆ لیکن نبی تو نہ قصد جھوٹ بولتا ہے اور نہ بلا قصد جھوٹ بولتا ہے، لہذا صاف معلوم ہوا کہ آیت کے معنی یہ نہیں ہیں، اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف کذب منسوب ہو گیا، اور نبی جھوٹ بولتا نہیں کیونکہ جو جھوٹا ہو وہ نبی ہونی نہیں سکتا، لہذا آیت کے معنی غلط کئے گئے ہیں۔

☆ پس اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ایک امر کو دو واقعوں کی صورت میں ظاہر کر دے، اگر حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف جھوٹ کی نسبت کریں تو یہ غلط ہے کیونکہ نبی جھوٹ نہیں بول سکتا اور اگر وہ جھوٹے نہیں تو پھر (معاذ اللہ) خدا تعالیٰ کا قول جھوٹا ہوگا، یہ تو اور بھی زبردست مصیبت ہوگی، تو معلوم ہوا کہ دونوں قول جھوٹ نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ایک امر کو دو واقعی صورتوں میں نمایاں کر دے۔

☆ حقیقت یہ ہے کہ مدت تو سو برس کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سو برس کی مدت کو عزیر علیہ السلام کے لئے اتنا چھوٹا کر کے گزرا کہ اُن کے لئے وہ ”یومًا“ بعض یوم“ ہو کر گزرا۔ پس حضرت عزیر علیہ السلام کا علم اس واقعہ کے مطابق ہے جو ان پر گزرا اور اللہ جل جلالہ کا کلام اس واقعہ اور حقیقت کے مطابق ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر گزرا، لہذا اللہ تعالیٰ کا کلام بھی سچا ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام کا کلام بھی سچا ہے، اس کی دلیل میں ایک واضح اور روشن بات یہ ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا مگر اہل ایمان صلحاء و اولیاء اور شہداء کے لئے ایک وقت کی نماز سے بھی جلدی گزرا جائے گا، قیامت میں اگر صالحین سے دریافت کیا جائے گا کہ تم یہاں کتنا عرصہ ٹھہرے تو وہ اپنا تجربہ و مشاہدہ کے مطابق وقت کا اختصار بیان کریں گے اور اگر کفار و مشرکین سے دریافت کیا جائے تو وہ اپنا حیران کر دینے والے اور ہر ایک اپنے قول اور دعوے میں سچا ہوگا۔

☆ اب بتائیے کہ جو اللہ پچاس ہزار برس کو ایک وقت کی نماز کے عرصہ میں تبدیل کر سکتا ہے، تو کیا وہ سو برس کے عرصہ کو ایک دن یا دن کے کچھ حصے میں تبدیل نہیں کر سکتا پس اللہ تعالیٰ کا کلام اس اصل واقعہ کے مطابق ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام کا کلام اُن کے علم کے مطابق ہے۔

☆ اب دوسری مثال سنئے قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے

☆ ”پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو سیر کرانی رات کے تھوڑے سے حصہ میں“ (پ ۱۵)

☆ اب اندازہ لگائیے کہ وہ تھوڑا عرصہ کتنا ہے کہ جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک تشریف لے جاتے ہیں اور اسی عرصہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے مصافحہ فرماتے ہیں، اسی مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء علیہم السلام کو نماز پڑھاتی، پھر حضور نور صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر تشریف لے جانا، ابواب سے گزرتا، وہاں انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کرتا، بیت المعمور ملاحظہ فرماتا، سورۃ النبی پر جبرئیل علیہ السلام کا علیحدہ ہونا، پھر رُفرف پر جلوہ گر ہونا، پھر دریائے نور میں غوطہ زن ہونا اور پھر ظاہر ہونا، پھر اللہ تعالیٰ کے عجایب عظمت کا مشاہدہ فرماتے ہوئے وہاں جانا جہاں نہ کوئی مکان ہے نہ زمان ہے، پھر عرش عظیم پر جلوہ گر ہونا۔ عرش سے اوپر جانا، اس کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے قرب خاص سے مشرف ہونا اور دیدار فرمانا، پھر نمازیں لینا، پھر نمازوں کی تعداد کم کرانے کے لئے بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام تک جا کر اللہ تعالیٰ کے حضور جانا، اب آپ بتائیں کہ ان سب کاموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتنا عرصہ تھا اور یہ کتنا وقت گزرا، پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو سفر معراج کا یہ اتنا طویل عرصہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھارہ سال تک سیر فرماتے رہے لیکن دنیا کے لئے اتنا طویل تھا کہ جب تشریف لائے تو بستر گرم تھا، دروازے کی ٹنڈی ٹل رہی تھی اور وضو کا پانی چل رہا تھا۔ [۱۰]

☆ پس ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ایک ہی وقت کو کسی کے لئے طویل کر دے اور کسی کے لئے کم کر دے، اسی طرح اولاد وہ واقع سو برس کا تھا لیکن حضرت عزیر علیہ السلام کے لئے وہ قلیل کر دیا گیا، معلوم ہوا کہ ”تل“ کا ابطال اس واقعہ کے مطابق تھا جو کہ علم الہی میں تھا۔

☆ اب میں ساری بحث کا فیصلہ قرآن کریم سے عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں آگے ارشاد فرمایا:

☆ ”فانظر الی طعامک و شرابک لم یسنه وانظر الی حمارک (پ ۳)

ترجمہ اب (ذرا) دیکھا اپنے کھانے اور پینے (کے سامان) کی طرف یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھا اپنے گدھے کو۔

☆ یعنی انگور اور انجیر کے رس کو دیکھئے کہ وہ سیاہی ہے اس سے بوتل نہیں آئی اور گدھے کے اعضاء بکھر گئے اور ہڈیاں چمک رہی ہیں (تفسیر ابن عباس)



☆ اب دیکھئے اللہ تعالیٰ نے جب سو برس کا عرصہ گزارا تو وہ سب کے لئے سو برس گزرا چاہئے تھا یعنی کھانے پینے کی چیزوں پر بھی اور ہمارے سو برس گزرتے، لیکن ہوا کیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ کہ بالکل متغیر نہیں ہوئے“ ان میں ذرا فرق نہ آیا، اب غور کرو جو چیز جلد خراب ہو جانے والی تھی وہ بالکل نہ بدلی اور گدھا جو طاقت ور ہے اس کی تمام ہڈیاں منتشر پڑی ہیں۔

☆ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عزیر علیہ السلام میں نے یہ سو برس کا عرصہ تجھ پر ”یوماً وبعض یوم“ کر کے گزارا، جس طرح تیرے لئے یہ عرصہ تھوڑا کیا تیرے کھانے اور پینے کی چیزوں کے لئے بھی قلیل کر دیا تا کہ تیرے کھانے اور پینے کا تازہ ہوتا تیرے ”یوماً وبعض یوم“ کی دلیل ہو جائے، پس تیرے دعویٰ کی دلیل تو یہ طعام اور انگوروں کا رس رکھا ہے، اب میرے دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ تو اپنے ہمارے گدھے کی طرف دیکھ، سو برس میں جو اس کا حال ہونا چاہئے وہی اس کا ہے، پس دونوں قول سچے ہیں۔

☆ میں نے ایک ایک جزا لگ لگ کر بیان کر دیا، اب کوئی کاغذ نہیں ڈال سکتا، یہ دھوکا میرے ساتھ بھی لیا (ضلع مظفر گڑھ) کے مناظرہ میں پیش آیا، میں نے جواب اسی طرح جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا، خدا کو کوہا کر کے کہتا ہوں کہ اس جواب کے بعد حاضرین و ناظرین پر صدمہ کالم کا منظر طاری تھا۔

☆ تو دوستو: جس کو صاحب قرآن سے نسبت نہیں اس کو قرآن سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، یہ قرآن کی حقیقتیں تب کھلتی ہیں جب صاحب قرآن سے نسبت ہو۔  
(وما علینا الا البلاغ)

## حواشی

[۱]۔ مولوی انور شاہ صاحب کشمیری، صد مدرس دارالعلوم دیوبند نے بھی اپنی تصنیف ”فیض الباری شرح صحیح بخاری، جز چہارم، صفحہ ۴۲۸ پر اس حدیث قدسی کے تحت یہی معنی لکھے ہیں۔

[۲]۔ امام فخر الدین رازی، تفسیر کبیر، سورہ کہف (آیہ ام حسب ان اصخب الکھف)، جلد ۲۱، صفحہ ۹۱  
[۳]۔ ”وکان ابن عمر یراهم شرار خلق اللہ وقال انهم انطلقوا الی ایات نزلت فی الکفار فجعلوا علی المؤمنین“ (بخاری شریف، جلد ۲، باب قتال الجوارح، ص ۱۰۲۴)

[۴]۔ امام جلال الدین سیوطی شافعی، شرح الصدور (عربی)، مطبوعہ مکتبہ خوشہدین (سوات)، ص ۶۳  
[۵]۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، جذب القلوب، مطبوعہ مکتبہ پاشک پٹی کراچی، ص ۲۰۳

[۶]۔ ۵۔ بت بن اسلم بنانی بصری تابعی ہیں، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے روایت کی ہے، یہ چالیس سال حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہے، شہرہ کہتے ہیں کہ ایک دن اور ایک رات میں قرآن ختم کیا کرتے تھے اور صائم الدہر تھے، ۱۲۳ھ میں وفات ہوئی۔

[۷]۔ علامہ عبدالحق بن ابی فلسطینی، کشف النور (عربی)، مطبوعہ مکتبہ قادریہ لاہور، ص ۹  
[۸]۔ امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)، شرح الصدور (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی، ص ۲۰۵

[۹]۔ بخاری شریف  
[۱۰]۔ تفسیر روح المعانی (عربی) پ ۱۵

نوٹ ☆ علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۸۶ء) نے یہ تقریر بروز پیر ۹ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ بمطابق ۳ فروری ۱۹۶۳ء کو جامعہ انوار العلوم پکھری روڈ ملتان میں بسلسلہ درس قرآن حکیم فرمائی، جناب محمد مختار حسن ایم اے مرحوم (پاکستان کے مشہور خطاط ابن کلیم کے بڑے بھائی) نے اسے لکھا، ظلیل احمد رانا نے اسے ترتیب دیا۔ ظلیل احمد رانا



# مقصود کائنات



نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

☆ محترم حضرات! یہ ربیع الاول کا نورانی مہینہ، وہ مقدس مہینہ ہے جس میں سید الطہین والہاہرین، امیر المؤمنین جناب احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس دنیا میں جلوہ گر ہوئے۔

☆ اے ماہ ربیع الاول تیری عظمتوں کو سلام تیرے دامن میں اللہ کے محبوب کی ولادت باسعادت کے جلوے نظر آرہے ہیں جو مومنین کے دلوں کو روشن کر رہے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت نے حقائق کائنات کو منور کر دیا۔ حضور ﷺ خود نور ہیں اور اس نور نے تمام عالم کو ”نور علی نور“ کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا  
هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ (س نوبہ آیت ۳۳)  
ترجمہ ☆ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا (س آل عمران آیت ۱۶۳)  
ترجمہ ☆ اللہ نے ایمان والوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ان میں سے رسول کو بھیجا  
قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ط (س مائدہ آیت ۱۱)  
ترجمہ ☆ تمہارے پاس نور آیا اور روشن کتاب آئی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا (س احزاب آیت ۴۴)  
ترجمہ ☆ اے پیارے نبی! ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا۔

☆ قرآن پاک کے عنوانات کو دیکھئے کہ حضور ﷺ کے آنے سے پہلے جانے، مبعوث ہونے، جلوہ گر ہونے کیلئے کیسے کیسے عنوانات اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرمائے ہیں اور اس سے حضور ﷺ کے تشریف لائے عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا  
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ط (س انبیاء آیت ۱۰۷)

☆ نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ تمام کائنات کیلئے رحمت ہے اور حضور ﷺ تمام عالم کیلئے ہدایت بن کر تشریف لائے اور قرآن نے صاف کہا  
هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ (س نوبہ آیت ۳۳)

☆ میرے دوستو اور عزیزو! حضور ﷺ کی ولادت باسعادت کا مضمون جب ذہن میں آتا ہے تو تین چیزیں اپنے ساتھ لاتا ہے۔  
(۱) خلقت محمدی (۲) ولادت محمدی (۳) بعثت محمدی

☆ خلقت سے مراد ہے ساری کائنات سے پہلے حضور ﷺ کا پیدا ہونا زبان نبوت نے فرمایا

☆ اول ما خلق الله نوری سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا

يا جابر اول ما خلق الله نور نبيك ..... (روح المعانی)

ترجمہ ☆ اے جابر جو چیز اللہ نے سب سے پہلے پیدا کی وہ تیرے نبی کا نور ہے۔



☆ حضرت امام مجدد الف ثانی سیدی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات شریف میں ایک حدیث نقل کی ہے اس کے الفاظ ہیں

قال رسول الله اخلقت من نور الله

ترجمہ ☆ حضور ﷺ نے فرمایا میں اللہ کے نور سے پیدا کیا گیا ہوں۔

☆ یہ ہمارا عقیدہ ہے، ہمارا مسلک ہے، ہمارا مذہب ہے کہ حضور ﷺ نور ہیں اور حضور ﷺ اللہ کے نور سے پیدا ہوئے اور حضور ﷺ نے فرمایا انا اولہم خلقتا

میں سب سے پہلے پیدا ہوا ہوں۔ وَاخِرُهُمْ بَعَثْنَا اور سب نبیوں کے بعد آیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی اولیت کا ذکر اور مقامات پر بھی فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں آیا

ہے

☆ كُنْتُ نَبِيًّا وَاَدَمُ نَبِيٌّ الْعَمَاءُ وَالْطَّيِّبُ لَعْنِي مَن نَبِيٍّ تَحَابَبَ آدَمُ مَنِيٍّ اور پانی میں تھے۔ ایک اور مضمون اسی حدیث کا ترمذی شریف میں مروایت حسن، امام ترمذی

نے روایت کیا

☆ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كُنْتُ نَبِيًّا وَاَدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ فرمایا میں نبی تھا اور آدم ﷺ ابھی جسد اور روح میں تھے۔ یعنی ان کی روح ان کے جسم

میں داخل نہیں ہوئی تھی اس وقت بھی میں نبی تھا۔

☆ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدم ﷺ کی روح ان کے بدن میں نہیں پڑی تھی تو میں اللہ کے علم میں نبی تھا اب کوئی ان سے پوچھے کہ خدا

کے بندو! کیا اس وقت حضور ﷺ ہی اللہ کے علم میں تھے اور کوئی نبی اللہ کے علم میں نہیں تھا؟ بھائی یہ کیا تماشا ہے اور اگر حضور ﷺ کے علاوہ سب نبی اللہ کے علم میں تھے تو پھر

حدیث کا کیا مطلب ہوا؟ اس کے متفقین نے صاف کہا کہ كُنْتُ نَبِيًّا وَاَدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ کا مفہوم یہ ہے کہ میں مسند نبوت پر جلوہ گر تھا اور ارواح انبیاء علیہم

السلام کنوت کا فیض عطا فرما رہا تھا۔

☆ ہمارا مسلک ہے کہ حضور ﷺ مبدء کائنات ہیں، حضور ﷺ مخزن کائنات ہیں۔ حضور ﷺ منشاء کائنات ہیں اور مجھے کہنے دیجئے کہ حضور ﷺ قصود کائنات

ہیں۔

☆ ایک حدیث میں آیا ہے ”كُوْلَاكَ لَمَّا خُلِقْتَ الدُّنْيَا“ یعنی اے پیارے حبیب تو نہ ہوتا تو میں دنیا کو نہ بناتا۔ ایک حدیث میں آیا لَوْلَاكَ لَمَّا خُلِقْتَ

الْاَفْلَاكُ یعنی میرے نبی اگر تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔ اور تفسیر حسینی میں ایک حدیث نقل کی گئی لَوْلَاكَ لَمَّا اُظْهِرْتَ لِرُبُوبِيَّةِ پيارے ہمارے گرو

نہ ہوتا تو میں اپنے رب ہونے کو ظاہر نہ کرتا۔

☆ اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ احادیث ضعیف ہیں، یہ نہیں کہتے کہ ہمارا عقیدہ ضعیف ہے۔ اور میں تو حضور ﷺ کے اول ہونے کا مضمون قرآن سے سمجھتا

ہوں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صاف فرمایا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ط (س انبیاء آیت ۱۰۷)

ترجمہ ☆ پیارے حبیب ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر سارے عالموں کے لئے رحمت بنا کر۔

☆ اب بتائیے کہ سارے عالموں میں سوائے اللہ کے سب کچھ شامل ہے یا نہیں؟ ہم سے جو پہلے تھے وہ بھی العالمین میں شامل ہیں تو بتائیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا

حضور ﷺ سب کے لئے رحمت کرنے والے ہیں کہ نہیں؟ ہیں اور ضرور ہیں۔

☆ رحمت مصدر ہے اور راحم کے معنی میں ہے۔ صاحب روح المعانی علامہ سید محمود آلوسی حنفی بغدادی نے ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ کا ترجمہ کرتے

ہوئے لکھا

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَاحِمًا لِّلْعَالَمِينَ ط

ترجمہ ☆ یعنی اے پیارے حبیب ہم نے آپ کو نہیں بھیجا۔ مگر سارے عالموں کے لئے رحم کرنے والا بنا کر۔

☆ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ سارے عالموں میں اللہ کے سوا سب کچھ شامل ہے کہ نہیں؟ زمین بھی، آسمان بھی، فرش بھی، عرش بھی، ملک بھی، فلک بھی،

تمام جواہر بھی، عناصر بھی، تمام عالم اجسام، تمام عالم ارواح، موالید ثلاث، عالم خلق، عالم امر، عالم تحت، عالم فوق، کل کائنات، العالمین میں داخل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا



☆ ”میرے پیارے میں نے آپ کو سارے عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا“

☆ میرے پیارے دوستو اور عزیزو! یہ بات ہمارے سامنے قرآن کی آیت میں ہے کہ آپ سارے عالموں کیلئے رحمت ہیں اور رحمت مصدر ہے اور فاعل کے معنی میں ہے یعنی آپ سارے عالموں کیلئے رحم ہیں۔ جو سارے عالموں کیلئے رحمت کرنے والے ہوں تو ایمان سے کہنا کہ سارے عالموں کی حاجت ان کے دامن سے وابستہ ہوگی کہ نہیں۔ بے شک ہوگی۔

☆ صاحب روح المعانی نے عارفین کا ایک قول نقل کیا ہے اور یہ بتایا کہ حضور ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی وجہ کیا ہے؟ فرماتے ہیں وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ اصل ہیں اور العالمین فرع، اصل جڑ کو کہتے ہیں اور فرع شاخ کو۔

☆ اب یہ بتائیے کہ جڑ نہ ہو تو کیا شاخیں باقی رہیں گی؟ اگر درخت کی جڑ سوکھ جائے تو کیا شاخیں ہری رہیں گی؟ یقیناً نہیں۔ ارے درخت کی جڑ سے تو سارا کام ہوتا ہے۔ جڑ تے کو نفاذ پہنچاتی ہے اور جڑ کی پہنچائی ہوئی غذا تے سے موٹی شاخوں میں پہنچتی ہے اور پھر چھوٹی چھوٹی شاخوں میں پہنچتی ہے پھر پتوں میں پہنچتی ہے اور پھر پھولوں اور پھلوں میں پہنچتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سارا اتنا اس جڑ کا محتاج ہے اور شاخیں اس جڑ کی محتاج ہیں اور ہر پتہ اور ہر پھول اور پھل اس کا محتاج ہے۔ جب تک اس جڑ کا فیض جاری ہے تو شاخیں ہری ہیں اور اگر جڑ کا فیض ختم ہو جائے تو شاخیں بھی سوکھ جائیں گی۔ جس طرح جڑ کو شاخوں کے ساتھ طبعاً رحمت کا جذبہ پایا جاتا ہے، اسی طرح حضور ﷺ کی ذات پاک میں العالمین کے ہر ذرے کے لئے رحمت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

☆ میرے آقا حضرت محمد ﷺ تمام کائنات کے ذرے ذرے کیلئے اصل ہیں اور اس کائنات کا ہر ذرہ، ہر فرد اور ہر گل جو ہمیں نظر آتا ہے اور جو ہمیں نظر نہیں آتا خواہ وہ زمین کے اوپر ہے، خواہ زمین کے نیچے، وہ ہواؤں میں ہو یا خلاؤں میں، وہ فضاؤں میں ہو یا دریاؤں میں یا پہاڑوں میں ہو، وہ کہیں بھی ہو، زمین میں ہو یا آسمان میں، تخت میں ہو یا فوق میں ہے جہاں بھی کوئی ذرہ ہے، مصطفیٰ ﷺ کی جڑ کیلئے شاخ ہے اور حضور ﷺ کا فیض اس طرح کائنات کے ہر ذرے کو پہنچ رہا ہے، جیسے جڑ کا فیض شاخ کے ہر جڑ کو پہنچ رہا ہے۔

☆ اب یہ بتائیے کہ جڑ پہلے ہوگی یا شاخ، یقیناً جڑ پہلے ہوگی تو یوں کہنے کہ شاخیں تو العالمین ہیں اور جڑ حضور ﷺ ہیں تو حضور ﷺ پہلے ہوئے اور العالمین بعد میں۔ اب آپ یہ بتائیں کہ شاخ کو جڑ کی حاجت ہے کہ نہیں؟ یقیناً ہے تو یوں کہنے کہ ساری کائنات کو مصطفیٰ ﷺ کی حاجت ہے اور میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ جس کی حاجت ہو وہ پہلے ہوتا ہے اور حاجت والا بعد کو ہوتا ہے۔ تمام کائنات کو حضور ﷺ کی حاجت ہے۔ اس لئے حضور ﷺ پہلے ہیں اور..... کائنات بعد میں ہوئی۔ میرا تو ایمان ہے کہ اگر حضور ﷺ نہ ہوں تو کائنات زندہ نہیں رہ سکتی۔

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا، وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو

جان ہیں وہ جہاں کی جان ہے تو جہاں ہے

☆ یہ کیا تصور ہے کہ وہ ہر کونسی میں مل گئے (نعوذ باللہ) ارے وہ ہر گئے تو ہم کیسے زندہ رہ گئے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ پاور ہاؤس میں تو بجلی ہے نہیں مگر میرے گھر کے تمام بلب روشن ہیں، کیا آپ اس کی بات کو مان لیں گے؟ یقیناً نہیں۔ اے خدا کے بندے پاور ہاؤس میں تو بجلی ہے نہیں تو تیرے گھر کے بلب کیسے روشن ہیں؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ پاور ہاؤس میں بجلی موجود ہو اور تیرے گھر میں اندھیرا ہو۔ اس لئے کہ تو نے فٹنگ نہ کرائی ہو اور شاید فٹنگ بھی کرائی ہو تو کنکشن نہ لیا ہو اور ممکن ہے کنکشن بھی لیا ہو تو ابھی بلب نہ لگایا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بلب بھی لگا ہو مگر فیوزی اڑ گیا ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر پاور ہاؤس میں بجلی ہو تو تیرے گھر اندھیرا ہو سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ پاور ہاؤس میں تو بجلی نہ ہو اور تیرے گھر میں روشنی ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ حضور ﷺ زندہ ہوں اور ہم مردہ ہو جائیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ حضور ﷺ معاذ اللہ مردہ ہوں اور ہم زندہ رہیں۔ کیوں کہ حضور ﷺ اصل ہیں، حضور ﷺ مخزن حیات ہیں، منبع حیات ہیں، معدن حیات ہیں اور ساری کائنات کے لئے بنیاد ہیں اور بنیاد کے بغیر کوئی شے زندہ نہیں رہ سکتی۔

☆ یہاں شاید کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ حضور ﷺ پانی بھی پیتے تھے، حضور ﷺ زمین پر چلتے تھے، ہوا میں سانس لیتے تھے تو پھر حضور ﷺ کو بھی ان ساری



چیزوں کی حاجت ہوئی۔ اگر ہمیں حاجت ہے تو پھر حضور ﷺ کو بھی حاجت ہوئی۔ اگر کوئی اپنے ذہن میں یہ تصور رکھتا ہے تو معراج کی رات کا تصور قائم کرے۔ اگر زمین ہمارے پاؤں تلے نہ ہو تو ہم کیسے ٹھہریں گے، ہوا نہ ہو تو ہم سانس کہاں لیں گے، پانی نہ ہو تو ہماری زندگی کیسے برقرار رہے گی لیکن جب معراج کی رات آئی تو مسئلہ حل ہو گیا، کیا ہوا، ایمان سے کہنا زمین نیچے رہی مصطفیٰ ﷺ اوپر چلے گئے تم زمین چھوڑ کر ذرا اوپر جا کر دکھاؤ تو پتہ چلے۔ معراج کی رات یہ مسئلہ حل ہو گیا اور بتا دیا کہ دیکھ لو زمین نیچے ہے، مصطفیٰ ﷺ اوپر ہیں۔ اگر وہ اس کے محتاج ہوتے تو اس کے بغیر کیسے رہ گئے۔ سمجھ لو کہ مصطفیٰ ﷺ اس کے محتاج نہیں ہیں اور جب حضور ﷺ معراج پر گئے تو ایمان سے کہنا کہ پانی نیچے رہا کہ نہیں رہا۔ آگ نیچے رہی، ہوا نیچے رہی۔ پتہ چلا کہ حضور ﷺ نہ آگ کے محتاج تھے نہ پانی کے محتاج تھے، نہ ہوا کے محتاج تھے اور نہ زمین کے محتاج تھے۔

☆ شاید کوئی یہ گمان کرے کہ حضور ﷺ آسمان کے محتاج ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا پیارے پہلے آسمان کو چھوڑ کر دوسرے آسمان پر آ جاؤ آسمان کا بھی محتاج نہیں ہے اور شاید یہ سمجھتا کہ دوسرے کے محتاج ہیں۔ اللہ نے فرمایا پیارے حبیب دوسرے کو چھوڑ کر تیسرے پر آ جا کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ یہ دوسرے کا بھی محتاج نہیں ہے، پھر چوتھے پر بلایا، پانچویں، چھٹے اور ساتویں پر بلایا پھر عرش پر بلایا حضور ﷺ جب عرش پر پہنچو شاید لوگ سمجھتے کہ یہ عرش کے محتاج ہیں۔ اللہ نے فرمایا پیارے عرش کو نیچے چھوڑ دے تو اوپر چلا آ۔

☆ اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو میں ایک بات کہتا ہوں کہ حضور ﷺ تو وہاں گئے جہاں نہ مکان تھا نہ لاسکان۔ کیا مطلب ہوا، مکان نیچے رہا، مصطفیٰ ﷺ اوپر ہوئے لاسکان نیچے رہا مصطفیٰ ﷺ اوپر ہوئے معلوم ہوا کہ جو کسی کا محتاج ہو وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہمارے نبی ﷺ نہ زمین کے محتاج ہیں نہ آسمان کے نہ وہ مکان کے محتاج ہیں نہ لاسکان کے محتاج ہیں، ہر سورت و ساری کائنات میں کسی کے محتاج نہیں، کائنات ان کی محتاج ہے وہ فقط خالق کائنات کے محتاج ہیں۔

☆ یہاں ایک شبہ پیدا ہو گیا کہ جو کسی کا محتاج ہو وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا کیوں کہ پرندہ ہوا کا محتاج ہے اور مچھلی پانی کی محتاج ہے۔ پرندوں کو ہوا سے الگ کر دو تو پرندے ہوا کے بغیر مر جائیں گے۔ اس طرح اگر مچھلی کو پانی سے الگ کر دو پانی کے بغیر مچھلی مر جائے گی۔

☆ اگر یہ بات ہے تو شبہ یہ ہے کہ معراج کی رات حضور ﷺ ساری کائنات کو چھوڑ کر لاسکان پر چلے گئے بلکہ لاسکان کو بھی چھوڑ کر اوپر چلے گئے تو اگر یہ کائنات حضور ﷺ کی محتاج تھی تو یہ حضور ﷺ کے بغیر کیسے رہ گئی؟..... کیوں کہ جو کسی کا محتاج ہوتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ حضور ﷺ ہیں نہیں اور زمین ہے۔ حضور ﷺ ہیں نہیں اور آسمان ہے۔ حضور ﷺ ہیں نہیں اور پانی ہے۔ حضور ﷺ ہیں نہیں اور آگ ہے۔ حضور ﷺ ہیں نہیں اور ہوا ہے۔ حضور ﷺ ہیں نہیں اور جواہر ہیں۔ حضور ﷺ ہیں نہیں اور اجسام ہیں۔ حضور ﷺ ہیں نہیں اور ارواح ہیں۔ حضور ﷺ ہیں نہیں اور عرش ہے۔ حضور ﷺ ہیں نہیں اور فرش ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے یہ تو حضور ﷺ کے محتاج ہیں تو اگر حضور ﷺ نہیں تو یہ کیسے رہ گئے؟

☆ میرے دوستو عزیزو! میں یہی بات آپ کے ذہن میں ڈالنا چاہتا ہوں کہ ہم نے سمجھا ہی نہیں کہ مصطفیٰ ﷺ ہیں کیا؟

☆ میرے دوستو اور عزیزو! خدا کی قسم! حضور ﷺ خدا نہیں ہیں، وہ خدا کے شریک نہیں ہیں، حضور ﷺ خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔ خدا بیٹے سے پاک ہے خدا شریک سے پاک ہے۔ خدا وحدہ لا شریک ہے۔ حضور ﷺ نہ خدا ہیں نہ خدا کے شریک ہیں، ہمارے وہو خدا کے حبیب ہیں اور خدا کے عبد مقدس ہیں۔

☆ اب آپ کہیں گے جب وہ عبد مقدس ہیں تو مخلوق ان کے بغیر کیسے رہ گئی۔ بس یہ بات آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ قرآن حکیم نے ان سب مسائل کو ہمارے سامنے رکھ دیا اور فرمایا

يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط (س نور آیت ۳۵)

ترجمہ ☆ یعنی اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے۔

☆ اللہ کی بیان کی ہوئی مثالوں کو دیکھو اور حقائق کو سمجھو، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا

وَكَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ط (سورہ انعام آیت ۷۵)

☆ اور اپنے پیارے حبیب ﷺ کے بارے میں فرمایا

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِآذِنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ط (سورہ احزاب آیت ۴۴-۴۵)



ترجمہ ☆ پیارے حبیب! ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا، ہم نے آپ کو مشر بنا کر بھیجا، ہم نے آپ کو نذر بنا کر بھیجا ہے۔ ہم نے آپ کو اپنی طرف سے اپنے حکم سے دعوت دینے والا بنا کر بھیجا ہے اور اے حبیب! ہم نے آپ کو راج منیر بنا کر بھیجا۔

☆ اللہ تعالیٰ نے میرے آقا حضور پر نور ﷺ کو راج کس لئے بنایا؟ یقیناً الظلمین کے لئے بنایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے  
فَبَارِكْ الَّذِي مَوْلَاهُ الْقُرْآنَ وَعَلَىٰ غُصْبِهِ يُعْذِرُ لِّلْعَالَمِينَ فَنُذِرُوا (س: فرقان، آیت: ۱)

☆ تو بھائی جیسا ماحول ہوگا سراج بھی ویسا ہوگا۔ کوئی کسی چھوٹے کمرے کا چراغ ہوگا، کوئی کسی بڑے حال کا چراغ ہوگا، کوئی پورے گھر کا چراغ ہوگا، کوئی پورے شہر کا چراغ ہوگا اور کوئی پورے ملک کا چراغ ہوگا۔ لیکن محمد مصطفیٰ ﷺ تو ساری کائنات کے چراغ ہیں۔ اب بتائیے کہ چراغ ایک جگہ ہوتا ہے اس کی ٹوا ایک جگہ ہوتی ہے لیکن اس کی روشنی کہاں تک جاتی ہے اس کی روشنی چھتوں پر ہوتی ہے اس کی روشنی سب جگہ ہے۔

☆ میرے دوستو! عزیزو! میرے آقائے نامدار ﷺ تو سراج منیر ہیں تو سمجھ لو کہ میرے آقا فرشتے ہیں تو اس کی روشنی عرش پر جاتی ہے۔ اگر وہ مدینے کا چراغ عرش پر ہے تو اس کی روشنی فرشتے تک جارہی ہے اگر وہ چراغ رکان میں ہے تو لا رکان تک اس کی روشنی جاتی ہے اور اگر وہ چراغ لا رکان میں ہے تو رکان تک اس کی روشنی جارہی ہے تو جہاں اس کی روشنی ہے وہاں مصطفیٰ ﷺ موجود ہیں اور جب موجود ہیں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ ان کے بغیر کائنات زندہ رہ سکے۔

☆ میرے دوستو! عزیزو! یہ مصطفیٰ ﷺ کا کمال، یہ حضور ﷺ کا کمال، یہ حضور ﷺ کا حسن، یہ حضور ﷺ کا جمال حضور کا نہیں، حضور ﷺ تو خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کا آئینہ ہیں۔ میں نہیں کہتا اب زبان نبوت تجھ پر کروڑوں درود اور سلام، حضور ﷺ نے فرمایا!

☆ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ رَأَىٰ فَقَدْ رَأَىٰ الْحَقَّ فَرَمَا "جس نے مجھے دیکھا اس نے حق کو دیکھا۔" یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ بخاری میں بھی ہے اور مسلم شریف میں بھی۔

☆ ہم حضور ﷺ کو خدا کا شریک نہیں مانتے، ہم حضور ﷺ کو خدا تعالیٰ کی مثل نہیں مانتے، ہم حضور ﷺ کو خدا کا نظیر نہیں مانتے تعالیٰ اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔ اللہ تعالیٰ نظیر سے پاک ہے، وہ مثل سے پاک ہے، وہ شریک سے پاک ہے، ارے حضور ﷺ اللہ کے شریک نہیں ہیں۔ واللہ باللہ ثم باللہ! حضور ﷺ تو خدا کی ذات و صفات کا آئینہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے جمال الوہیت کو اپنے حبیب ﷺ کی ذات میں ظاہر کیا۔ میں حیران ہوں کہ اگر یہ شریک ہے تو پھر ساری کائنات شرک سے بھری پڑی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ میں اور مجھ میں کوئی خوبی ہے تو وہ کس کی ہے میری اور تمہاری ہے یا خدا کی دی ہوئی ہے؟ یقیناً خدا کی عطا کردہ ہے تو جب خدا کا کمال تم میں اور مجھ میں ظاہر ہو تو کوئی شرک نہیں اور حضور ﷺ میں ظاہر ہو تو شرک ہو جائے کیا تمنا ہے؟

☆ میرے دوستو! عزیزو! ہم حضور ﷺ کو خدا کا جزو نہیں سمجھتے بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کم تو حضور ﷺ کو خدا کے نور سے مانتے ہو تو بتاؤ نور حضور ﷺ میں آیا اتنا نور خدا میں کم ہو گیا لہذا تم نے حضور ﷺ کو خدا کے نور سے مان کر خدا کے نور کو ناقص کر دیا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

☆ عزیزان گرامی! دیکھئے یہ بات تو تیرے ہوگی کہ جب خدا کا کوئی جز ہو، وہ تو جز سے پاک ہے اور مجھے کہنے دیجئے وہ جز ہی نہیں بلکہ وہ تو کل سے بھی پاک ہے نہ خدا کو جز کہہ سکتے ہیں اور نہ کل کہہ سکتے ہیں۔ ہاں وہ جز کا بھی خالق ہے اور کل کا بھی خالق ہے خود نہ جز ہے نہ کل ہے۔ جز اس لئے نہیں کہ اگر ہم خدا کو جز مان لیں تو ترکیب ہوگی اور جہاں ترکیب ہوگی وہاں حدوث ہوگا۔ اگر حدوث ہو تو خدا تعالیٰ کا وجود ختم ہو گیا اور اگر ہم خدا کو کل مان لیں گے تب بھی یہی بات ہوگی۔

کیوں کہ کل کے معنی تو یہ ہیں کہ بہت سے اجزاء کو جمع کر لو اور سب کو ملا لو اجزاء کے مجموعے کا نام کل ہوتا ہے اجزاء ہوں گے تو مجموعہ ہوگا اور اگر مجموعہ نہیں تو کل نہیں اور اجزاء نہیں تو کل نہیں اگر خدا کو کل کہو گے تو پہلے اجزاء ماننے پڑیں گے۔ ایمان سے کہنا کہ کیا خدا کے اجزاء ہیں، اگر اجزاء نہیں تو مجموعہ کہاں سے آئے گا۔ مجموعہ نہیں تو کل کس کو کہو گے اس لئے مان لو کہ خدا کل نہیں خدا تو ہر کل کا خالق ہے۔ ہر کل کو خدا نے پیدا کیا۔ خدا جز نہیں ہے بلکہ وہ ہر جز کا خالق ہے اور ہر جز کو خدا نے پیدا کیا لہذا حضور ﷺ خدا کا جز نہیں ہیں۔

☆ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور ﷺ خدا کے نور سے کیسے پیدا ہو گئے کیونکہ خدا کا نور تو کبھی جز نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں، دیکھئے سورج آسمان پر چمک رہا ہے، آپ نیچے زمین پر آئینہ رکھ دیں، ایمان سے کہنا کہ اس شیشے میں سورج چمکتا ہوا نظر آئے گا یا نہیں؟ اس آئینے میں روشنی اور نور آئے گا یا نہیں۔ یقیناً آئے گا اب بتائیے



کہ اس میں جو روشنی ہے وہ سورج کی ہے یا نہیں؟ (اس کے بعد بھی) اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں جناب یہ سورج کی روشنی نہیں ہے (تو ایسے کم فہم نے حقائق سے اعراض کیا) اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جتنی روشنی اس (آئینہ) میں آئی اتنی روشنی سورج میں کم ہو جانی چاہئے؟ کیا آپ اس بات کو مان لیں گے؟ یقیناً نہیں مانیں گے، آپ دوسرا آئینہ رکھ دیں، تیسرا رکھ دیں، لاکھوں بلکہ کروڑوں شیشے زمین پر بچھا دیں، ہر آئینہ میں پورا سورج نظر آئے گا۔ مگر وہاں کوئی کی نہیں آئے گی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں صاحب کی تو ہوگی تو میں اُن سے یہ پوچھتا ہوں کہ ایک دوشیشے رکھنے سے کچھ کی ہوا اگر ہزاروں لاکھوں شیشے رکھ دئے جائیں تو سورج کا بالکل صفایا ہی ہو جانا چاہئے اور سورج کا سارا نور ان آئینوں میں تقسیم ہو کر ختم ہو جائے تو بھائی اگر کروڑوں شیشے بھی رکھ دئے جائیں تو وہاں کی نہیں آئے گی۔ جب وہاں کی نہیں آئی تو پتہ چلا کہ شیشہ جو سورج کے نیچے رکھا ہے وہ سورج کا جز نہیں ہے اور سورج جو اس میں چمکتا ہوا نظر آ رہا ہے آپ اس شیشے کے نور کو کیا کہیں گے، سورج کا جز نہیں کہہ سکتے، بلکہ سورج کا جلوہ کہیں گے۔ کیوں کہ نہ تو اصل سورج شیشے میں آیا اور نہ ہی شیشہ سورج کا حصہ بنا بلکہ شیشہ سورج کے نور کا مظہر بنا۔

☆ میرے آقا حضورؐ نور علیہ نے فرمایا

”انما مرآة جمال الحق“ یعنی ”میں تو حق کے جمال کا آئینہ ہوں“

☆ شیشے میں جو نور نظر آئے گا وہ آفتاب کا نور ہوگا اور مصطفیٰؐ میں جو نور نظر آئے گا وہ خدا کا نور ہوگا۔ بس میں یہ کہتا ہوں کہ حضورؐ میں جو علم نظر آیا وہ حضورؐ کا نہیں بلکہ خدا کا علم ہے، جو قدرت حضورؐ میں نظر آئی وہ حضورؐ کی نہیں وہ خدا کی ہے اگر حضورؐ میں خدا کی قدرت کا ظہور نہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ جنیل ابوقیس پر حضورؐ نے چاند کو انگلی کا اشارہ فرمایا اور چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہ حضورؐ کی قدرت تھی بلکہ خدا کی قدرت کا ظہور تھا۔

☆ میرے دوست اور عزیزو! ہمیں دین ملا تو رسول اللہؐ کی زبان سے، خدا کی معرفت ملی تو رسول کی زبان سے قرآن ملا تو رسول اللہؐ کی زبان سے، قرآن اللہ کا کلام ہے لیکن اللہ کا کلام ہونیکے باوجود وہ رسول اللہؐ کا کہا ہوا ہے، میں نہیں کہتا قرآن کہتا ہے۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ (س معارج آیت ۴۰)

ترجمہ ☆ یعنی ”قرآن کلام میرا ہے قول رسول کریم کا ہے۔“

☆ اگر رسول کریمؐ کہہ کر نہ بتاتے تو تمہیں کیا پتہ چلا کہ کیا ہے بلکہ خدا کے کلام کا جلوہ حضورؐ کے کلام میں، اللہ تعالیٰ کے علم کا جلوہ حضورؐ کی سمع میں سبحان اللہ! وہ کسی سمع ہے، بخاری شریف کی حدیث ہے حضورؐ نے معراج سے واپس تشریف لائے تو حضرت بلالؓ کو بلایا اور فرمایا بلال! اتو وہ عمل بتا جو تو کرتا ہے۔ میں نے جنت میں اپنے آگے تیرے چلنے کی آواز سنی ہے؟ یہاں لوگوں نے کہا، اگر حضورؐ کو علم ہوتا تو آپ حضرت بلال سے کیوں پوچھتے، ارے یہ بات نہ تھی کیوں کہ بلال نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا جس کا حضورؐ کو علم نہ ہو جس عمل کرنے سے حضرت بلالؓ کو یہ مرتبہ ملا اگر اس عمل کا علم حضورؐ کو نہ ہوتا تو عمل کرنے والا جنت میں کیسے جاسکتا ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ بلالؓ تم خود اپنے منہ سے کہتا کہ اس اہمیت والے عمل کا پتہ چلے اور لوگوں کو شوق پیدا ہو۔ یہ ایک نفسیاتی بات ہے۔

☆ حضرت بلالؓ نے کہا کہ میرے آقا تحریۃ الوضو بھی پڑھتا ہوں اور تحریۃ المسجد بھی پڑھتا ہوں۔ اب یہاں میں ایک بات آپ سے پوچھتا ہوں کہ جب حضورؐ نے معراج پر تشریف لے گئے تو کیا حضرت بلالؓ ساتھ گئے تھے؟ یقیناً نہیں گئے تھے اور جب گئے نہیں تو وہاں تھے نہیں تو چلے بھی نہیں، اور جب چلے نہیں تو چلنے کی آواز پیدا نہیں ہوئی اور جب آواز پیدا نہیں ہوئی تو حضورؐ نے کیا سنا؟ تو یہ کیا بات ہوئی۔

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلالؓ زمین پر چل رہے تھے۔ حضورؐ نے وہاں ان کی آواز سنی لی۔ اگر یہ بات ہے تو یہ بھی تمہارے لئے مصیبت ہے تم تو کہتے ہو کہ رسول اللہؐ کو یا رسول اللہ مت کہو، کیوں کہ آپ دور سے نہیں سنتے تو بھائی جو جنت میں رہ کر یہاں کی آواز سن لے تو وہ یا رسول اللہؐ کی آواز کیسے نہیں سنیں گے۔ مگر یہاں تو زمین پر چلنے کی بات نہیں۔ حضورؐ فرما رہے تھے، اے بلال! میں تیرے چلنے کی آواز اپنے کانوں سے سن رہا ہوں۔ بات تو جنت میں چلنے کی ہے اور حضرت بلالؓ حضورؐ کیساتھ گئے نہیں تو یہ کیا ہو گیا؟

☆ اب میرے ذوق کی بات ہے کوئی مانے یا نہ مانے مجھے چھوڑ دیں بات یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ جنت میں کوئی نئی داخل نہ ہوگا جب تک حضورؐ داخل نہ ہو جائیں اور کسی نئی کی امت داخل نہ ہوگی جب تک حضورؐ کی امت داخل نہ ہو جائے۔ حضورؐ کی حدیث ہے ”اَنَا أَوَّلُ مَنْ يَفْضَحُ بِأَبْوَابِ الْجَنَّةِ“ یعنی ”سب سے پہلے



جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے والا میں ہوں“ اور حضور ﷺ بڑی شان سے جنت میں جائیں گے۔ حضور ﷺ اپنی اونٹنی (ناقہ) پر سوار ہوں گے اور انکی مہار بلال کے ہاتھ میں ہوگی۔ اب ایمان سے کہنا کہ جسکے ہاتھ میں مہار ہو وہ پہلے آگے ہوگا کہ نہیں؟ یقیناً وہ آگے ہوگا۔ شاید آپ دل میں یہ سوچیں کہ ہم تو سنتے تھے کہ حضور ﷺ سے پہلے تو نبی بھی نہیں جائیں گے، یہاں تو بلال پہلے چلے گئے تو سنئے حضرت بلال پہلے نہیں گئے یہ تو مہار کی برکت ہے۔ مہار چھوڑ دیں پھر دیکھیں بلال کیسے جنت میں جاتے ہیں۔ حقیقت میں تو حضور ﷺ ہی پہلے جا رہے ہیں، ورنہ بلال تو حضور ﷺ کیساتھ لگ کر جا رہے ہیں تو حضور ﷺ ناقہ سواری پر سوار ہوں گے، حضرت بلال کے ہاتھ میں مہار ہوگی۔ بلال آگے آگے چلتے ہوں گے جب جنت میں چلیں گے تو آواز پیدا ہوگی تو جو آواز لاکھوں برس بعد پیدا ہوگی۔ حضور ﷺ نے وہ پہلے من ل۔ سبحان اللہ! میرے آقا آپ کی قوت سمجھ پر لاکھوں سلام۔

WWW.KAZIMIIS.COM

WWW.KAZIMIIS.COM

## عرفانِ ربانی کی ناطق دلیل



نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

☆ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ط..... (سورۃ توبہ آیت ۳۳)

☆ ترجمہ ”وہ“ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ وہ اسے غالب کر دے تمام ادیان پر۔

☆ سب سے پہلے تو بات یہ ہے کہ ”هُوَ“ ضمیر ہے یہ اسم ہے ”الَّذِي“ اسم موصول ہے لیکن یہ بھی اسم ہے یا درکیے کہ ضمیر ہوا موصول یہ دونوں اسم بہم ہوتے



ہیں۔ ان میں پوشیدگی ہوتی ہے۔

☆ ”ہُو“ (وہ) اب آپ کو کوئی پتہ نہ چلا کہ کون سی ذات تو ضمیر میں بھی ابہام ہوتا ہے اور موصول میں بھی ابہام ہوتا ہے۔ ضمیر کا ابہام مرجع سے دور ہوتا ہے جدھر ضمیر لوٹتی ہے تو معلوم ہوا کہ مرجع ضمیر سے ضمیر کا ابہام دور ہوگا۔ مثلاً میں کہوں کہ ”زید (مرجع) آیا اور اس (ضمیر) نے کہا“ ”اس نے“ یہ لفظ ”اس“ ضمیر ہے اب اس کا مرجع کیا ہے؟ زید ہے۔ جب تک زید نہ ہو ضمیر کا پتہ نہیں چلا اور اس کی پوشیدگی دور نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ ضمیر کی پوشیدگی مرجع سے دور ہوتی ہے اور اسم موصول میں جو ابہام اور پوشیدگی ہے وہ صلے سے دور ہوتا ہے۔ صلہ اسم موصول کے ابہام کو دور کرنے کے لئے ہے اور مرجع ضمیر کی پوشیدگی کو دور کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”هُوَ الَّذِي“ ”هُوَ“ ضمیر ”الَّذِي“ اسم موصول۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں اسم ہم بیان فرمائے۔ اب پتہ نہیں چلا کہ ”هُوَ“ کون اور ”الَّذِي“ کون تو بھی بات یہ ہے کہ موصول کا ابہام صلے سے دور ہوتا ہے اور وہ موصول کہ ضمیر کا مصداق بھی وہی ہے تو جب اس کا ابہام دور ہوگا تو ضمیر کا ابہام خود بخود دور ہو جائے گا۔

☆ ارشاد ہوتا ہے ”الَّذِي“ یہ ”الَّذِي“ اسم موصول ہے اور اس کا صلہ ہے اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَذِيْنِ الْحَقِّ اللّٰهُ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا۔ مقصد کیا ہے کہ جس طرح موصول کا ابہام صلے کے بغیر دور نہیں ہوتا، جس طرح ضمیر کا ابہام مرجع کے بغیر دور نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں تمہیں جو ابہام پڑ گیا ہے، وہ رسول کے بغیر دور نہیں ہوگا۔ مرجع کے بغیر ضمیر نہیں پہچانی جاتی۔ صلہ کے بغیر موصول کا پتہ نہیں چلا اور رسول کے بغیر خدا کا پتہ نہیں چلا۔ آپ کہیں گے کہ عاری مجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ رسول کے بغیر خدا کا پتہ نہیں چلا۔ قرآن کریم تو کہتا ہے کہ

اِنْ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآٰيٰتٍ لِّاُولٰٓئِی الِّیْ اَلْبَابِ ط (س آل عمران آیت ۱۹۰)

ترجمہ ☆ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں اہل عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔

☆ امور کائنات کا ہر ذرہ خدا کی قدرت کائنات ہے اور نشان سے اگر پتہ نہ چلو تو نشان کا ہے کہ تو آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ رسول کے بغیر خدا کا پتہ نہیں چلا۔ گھاس کا ایک تنکا بھی خدا تعالیٰ کی قدرت کائنات ہے۔ چاند، سورج، یہ دن رات کی گردشیں، ہوائیں، سمندر، پہاڑ، نباتات، جمادات، موالید، عناصر، معانی، اعراض، جواہر اور جملہ کائنات کا ایک ایک ذرہ خدا کی قدرت خدا کی معرفت کائنات ہے۔ اور نشان وہ ہوتا ہے جس سے کسی کا پتہ چلا ہے ہم چاند کو دیکھتے ہیں ہمیں خدا کا پتہ چل جاتا ہے، ہر مصنوع سے صالح کا پتہ چلا ہے۔ ہر مخلوق سے خالق کا پتہ چلا ہے تو تم کیسے کہتے ہو کہ رسول کے بغیر خدا کا پتہ نہیں چلا یہ بات تو مجھ میں نہیں آتی۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ کائنات کا ہر ذرہ خدا کی معرفت کائنات ہے۔ آمَنَّا وَصَلَّیْنا قرآن کہتا ہے۔

اِنْ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَخْرٰی فِی الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَخْبَاہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا وَبَنٰی فِیْہَا مِنْ کُلِّ دَاۡبِیۡۃٍ وَّلَنُصْرِیۡفَ الرِّیۡحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ط (سورة البقرة آیت ۱۶۴)

ترجمہ ☆ بے شک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی گردش میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائے ہوئے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو اور جو انار اللہ نے بادلوں سے پانی پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں اور بادل میں جو حکم کا پابند ہو کر آسمان اور زمین کے درمیان (کلنا رہتا) ہے (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

☆ اور نشان فی وہی ہوتی ہے جس سے کسی چیز کا پتہ چلا ہو تو نشان فی نشان والے کے لئے دلیل ہے، سورج کی دھوپ سورج کے لئے دلیل ہے، چاند کی چاندنی چاند کے لئے دلیل ہے تو کائنات کا ایک ایک ذرہ خدا کی ہستی کی دلیل، اس کی قدرت اور صفت کائنات ہے لیکن دلیلیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک خاموش دلیل اور ایک باطن دلیل۔

☆ کائنات کا ہر ذرہ خدا کی ذات کی دلیل اور خدا کی ہستی کائنات ہے لیکن یہ دو نشان اور وہ دلیلیں ہیں جو خاموش ہیں۔ یہاں تک کہ لوگوں نے ان دلیلوں کو دھوکے بنا دیا تب بھی یہ دلیلیں خاموش رہیں۔ کیا چاند نے اپنے پوجنے والوں کو کہا کہ بے حق فوج تم مجھے پوجے ہو میں تو دلیل ہوں تم دھوکے کو تسلیم کرو اور دھوکے کو پوجو تو بھی چاند کبھی نہیں بولا، سورج نہیں بولا، پتھروں کو لوگوں نے پوجا پتھر نہیں بولے، آگ کو پوجا، درختوں اور جانوروں کو پوجا یہ نہ بولے یہ سب دلیلیں تو تھیں مگر خاموش دلیلیں تھیں لوگ



پوچھے رہے یہ خاموش رہیں اور مطلق دُمل تو ایک حضور پر نور محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات مقدسہ ہے اور یقین کجیے کہ میرے آقا میرے مولانا جدار مدنی جناب محمد مصطفیٰ ﷺ ایسی مطلق دُمل ہیں کہ جو خاموش دُمل ان کے دامن میں آئی وہ بھی مطلق ہوگئی۔

☆ بتائیے کیا پھر مطلق ہیں؟ یقیناً نہیں، لیکن جب ابو جہل پھر اپنے ہاتھ میں لایا تو مطلق ہوئے یا نہیں؟ مجھ سے اگر پوچھو تو میں کہوں گا کہ چاند بھی مطلق ہوا اور سورج بھی مطلق ہوا۔ مگر نطق ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا اور اس کے اندر حکمتیں ہیں۔ اگر چاند سے آواز پیدا ہوتی تو لوگ سمجھتے کہ پتہ نہیں یہ آواز کہاں سے آئی، چاند سے ایسی کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی کہ لوگ شبہ میں پڑ جائیں بلکہ چاند کو ایسے مطلق کیا کہ اپنے محبوب کو حکم دیا کہ میرے پیارے تو اپنی انگلی اٹھا دے۔ حضور ﷺ نے انگلی اٹھائی اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایمان سے کہنا یہ اس کا مطلق ہونا نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ چاند نے مطلق ہو کر بتا دیا اگر محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول نہ ہوتے تو میں دو (۲) ٹکڑے کیسے ہو جاتا؟ اگر سورج سے کوئی ایسی کوئی آواز آ جاتی تو لوگ گھبرا جاتے، دھوکے میں پڑ جاتے کہ پتہ نہیں یہ آواز کس کی ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ یہ کیسے یقین ہوتا کہ سورج بول رہا ہے لیکن جب میرے آقا سرور عالم ﷺ نے منزل صہبا پر ڈوبے ہوئے سورج کو اشارہ کیا تو حدیث پاک میں آتا ہے

عن أسماء بنت عمیس ان النبی ﷺ کان یوحی الیہ وراسہ فی حجر علی فلم یصل العصر حتی غربت الشمس فقال رسول اللہ ﷺ اصلیت یا علی قال لا فقال اللهم انہ کان فی طاعتک وطاعة رسولک فاردد علیہ الشمس قالت اسماء فرأتہا غربت ثم رأیتہا طلعت بعد ما غربت ووقفت علی الجبال والارض وذلك بالنصہبأ فی خیبر

☆ یعنی حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ خیبر میں صہبا کے مقام پر سیدہ رو عالم ﷺ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی کوڑ میں سر مبارک رکھ کر آرام فرما رہے تھے اور حضور ﷺ پر کوئی نازل ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہو گیا اور حضرت مولانا علی رضی اللہ عنہ نے ابھی عصر کی نماز نہ پڑھی تھی۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، اے پیارے علی! کیا ابھی نماز نہیں پڑھی؟ حضرت مولانا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا نہیں تو رسول خدا ﷺ نے دعا کی، یا اللہ! پیارے علی تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھے لہذا سورج کو واپس لوٹا دے۔ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ میں نے سورج کو دیکھا کہ سورج غروب ہو چکا تھا پھر سورج واپس آیا زمین اور پہاڑوں پر دھوپ چگی۔

☆ کسی نے مجھ سے کہا کہ بھی تم نے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو رسول اللہ ﷺ سے بھی بڑھا دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک نماز قضا ہوئی تو حضور ﷺ نے سورج واپس کر دیا۔ مگر خود حضور ﷺ کی نماز قضا ہوگئی تو سورج واپس نہیں آیا۔ کیوں کہ غزوہ خندق کے موقع پر حضور ﷺ کی کئی نمازیں قضا ہو گئیں تو حضور ﷺ کی قضا نماز کے لئے تو سورج واپس نہیں آیا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک نماز قضا ہوگئی تو سورج واپس آ گیا۔ بھی یہ کیا بات ہوئی، تم نے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ سے بڑھا دیا۔

☆ میں نے کہا بھی یہ بات نہیں کیوں کہ غلاموں کا جو کمال ہوتا ہے وہ غلاموں کا نہیں ہوتا، بلکہ آقاؤں کا ہوتا ہے۔ مولائے کائنات حضرت علی رضی اللہ عنہ غلام ہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے، ان کی قضا نماز کے لئے سورج کا واپس آنا، یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کمال نہیں بلکہ آقا کے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا کمال ہے

☆ رہا یہ سوال کہ حضور ﷺ کی قضا نماز کے لئے سورج واپس کیوں نہ آیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام قیامت تک آنے والے مومنوں کے لئے اسوۂ حسنہ حضور ﷺ ہیں قرآن کہتا ہے

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورة الاحزاب آیت ۲۱)

☆ اگر حضور ﷺ کی قضا نماز کے لئے ڈوبا ہوا سورج واپس آ جاتا تو قیامت تک کے مسلمانوں کی قضا نماز کے لئے سورج واپس آتا اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہوتا۔ بہر حال مجھے کہنا یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قضا نماز کے لئے میرے آقا حضور پر نور ﷺ نے سورج کو اشارہ فرمایا تو ڈوبا ہوا سورج واپس آ گیا۔

☆ میرے دوستو! یہ ڈوبا ہوا سورج واپس آیا، آپ نے اس کی حقیقت پر غور کیا۔ درحقیقت سورج بھی تو خدا کی دُمل ہے۔ مگر ایسی خاموش دُمل کہ لوگ سورج کو پوچھے رہے۔ اس دُمل کو کوئی بتاتے رہے۔ مگر سورج کچھ بولا ہی نہیں لیکن حضور سرور کائنات ﷺ کی یہ شان ہے کہ جو خاموش دُمل حضور ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ میں آئے وہ مطلق ہو جاتی ہے تو سورج نے حضور ﷺ کے اشارے پر واپس آ کر گویا یہ نطق کیا کہ اگر حضور ﷺ اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے سچے رسول نہ ہوتے تو میں اشارے سے کیسے واپس آتا۔

تو پتہ چلا کہ حضور ﷺ مطلق دُمل ہیں اور کائنات کا ہر ذرہ اللہ تعالیٰ کی خاموش دُمل ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر مطلق دُمل ان چیزوں کو دُمل نہ بتاتی تو



ہمیں کیسے پتہ چلا کہ یہ دہل ہیں یا نہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے عقلاء ان دلیلوں کو دھوکا دیتے رہے تو معلوم ہوا کہ یہ وہ دلیلیں ہیں جو خاموش ہیں لیکن فرمایا اے میرے حبیب ﷺ ان کا دہل ہونا بھی تو تیرا دہن منہ ہے تو نے اپنی زبان نبوت سے فرمایا کہ یہ دہل ہیں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی زبان سے کہلویا

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ط (س آل عمران آیت ۱۹۰)

☆ بے شک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں اہل عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔

☆ پیارے محبوب! تو خدا کی وہ مطلق دہل ہے کہ ان دلیلوں کے دہل ہونے کا نطق بھی تو نے کیا اور یہ خاموش دلیلیں بھی تیری بارگاہ میں آکر مطلق ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اصل دہل تو حضور ﷺ ہیں اور باقی حضور ﷺ کے دامن سے لگ کر دہل ہوئیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اصل کے بغیر فرع نہیں ہوتی۔ جب اصل کے بغیر فرع ہوتی نہیں تو کوئی دہل رسول کے بغیر نہ ہوئی اور دہل نہ ہو تو دعویٰ کا پتہ نہیں چلا گیا حضور ﷺ نہ ہوتے تو خدا کا پتہ نہ چلا۔

☆ عزیز! ان گرامی! اتنی بات آپ کو بتا دوں کہ انسانوں نے مظاہر کائنات کو کیوں پوچھا؟ انسان کی فطرت میں تو خدا کی محبت تھی اور جس کی محبت تھی اسی کو پوجنا چاہئے تھا۔ یہ کیا کہ فطرت میں تو خدا کی محبت ہے اور پوج رہا ہے چاند اور سورج کو، یہ کیا بات ہوئی؟

☆ عزیز! ان گرامی! یہ دعائیں ذہن میں کیجا جن میں نہیں کہ انسان کے دل میں محبت تو خدا کی ہو اور پوجے بغیر خدا کو۔ یہ بات کیا ہے؟

☆ اب پہلا جملہ میں نے کہا کہ انسان کے جوہر فطرت میں محبت تو ہے خدا کی۔ یہ پہلا مقدمہ ہے۔ اس مقدمے کے لئے میں خط لفظ انسان ہی کو پیش کئے دیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ انسان کی فطرت کا جوہر ہے کہ اس میں خدا کی محبت ہے یعنی خدا کی محبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے تو بھی اس کی کیا وجہ ہے؟

☆ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو انسان کہتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ اُنس سے بٹا ہے اور اُنس کے معنی ہیں کہ اس نے محبت کی اور محبت کس سے کی؟ اسی بٹانے والے سے محبت کی تو انسان کہتے ہی اس کو ہیں کہ بٹانے والے سے محبت اپنی فطرت میں رکھتا ہو بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ انسان کی فطرت کا جوہر ہی خدا کی محبت ہے، خدا کا اُنس ہے کیوں کہ اسی اُنس سے تو وہ بٹا ہے اور اُنس کے معنی ہیں کہ اس نے محبت کی اور اُنس کا ماخذ ہے۔ ان۔ س۔ اس کا مادہ ہے اور اس کے معنی محبت کے ہیں تو پتہ نہیں چلا کہ جس کی محبت کا جوہر اس کی فطرت میں ہے اس کی بجائے اس کے بغیر کو پوجتا ہے۔

☆ میں نے ایک مرتبہ قاضی ادیان کا مضمون جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں پڑھا۔ یہ سوال میں نے خود کیا اور میں نے کہا کہ بھی قاضی ادیان میں ایک عنوان ”وحدت ادیان“ بھی آتا ہے کہ تمام دینوں کی اصل ایک ہے۔ اختلاف بعد میں ہوئے اور اتنے ہوئے کہ پھر وہ اصول اختلاف سے بھی آگے بڑھ گئے لیکن درحقیقت دین میں وحدت پائی جاتی ہے۔ دین ایک ہے اور پھر اس کے بعد جو مختلف راہیں ہوئیں وہ بعد کی چیز ہیں تو اس سلسلے میں نہیں نے کہا کہ بعض لوگوں نے وحدت ادیان کا بنیادی نقطہ یہ قرار دیا کہ بھی جب انسان خدا کی محبت اپنے اندر رکھتا ہے اور خدا کا اُنس اس کی فطرت میں ہے تو اب یہ مان لو کہ کوئی چاند کو پوجتا ہے تو وہ خدا ہی کو پوجتا ہے۔ اگر کوئی سورج کو پوجتا ہے تو وہ بھی خدا کو پوج رہا ہے۔ یہ دین جڑا لگ ہیں یہ سب ایک ہی ہیں۔ چاند یا سورج کو پوجنے والا ہو، آگ یا پانی کو پوجنے والا ہو، یہ سب ایک ہی خدا کے پیاری ہیں جو ان تمام کا خالق ہے اور اسی کی محبت سب کے دل میں ہے، لہذا خواہ ظاہری صورت میں کوئی کسی کی پوجا کر رہا ہو مگر ہم سب ہی سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی پوجا کر رہے ہیں۔

☆ میں نے کہا کہ بھی یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ اس شہ کا ازالہ لوگوں کے ذہنوں سے نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس تصویر کا دھواں رخ میں آپ حضرات کے سامنے پیش نہ کر دوں۔ یہ شہ بڑا قوی ہے۔ لوگ اس میں مبتلا ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ بھی کوئی خدا کو پوجے، کوئی رام کہے، کوئی رجم کہے، کوئی اللہ کہے، کوئی گاڈ (GOD) کہے، بات ایک ہی ہے۔ وہ اگر مندر میں جاتے ہیں تو تم مسجد میں جاتے ہو۔ ان کا بھی ایک گھر مخصوص ہے۔ تمہارا بھی گھر مخصوص ہے۔ وہ اپنے آگے مورتی کو رکھتے ہیں تو تم اپنے آگے خانہ کعبہ کو رکھتے ہو، اس کے بغیر تمہاری نماز نہیں ہوتی تو آخر خانہ کعبہ بھی تو پتھروں کا بنا ہوا ہے اور کیا ہے؟ کسی نے اپنے آگے پتھر کو رکھ لیا، کوئی اور چیز کو اپنے آگے رکھ کر عبادت کرتا ہے۔ لہذا سب آپس کے ٹکڑے ختم کرو، اسلام، یہودیت، عیسائیت، جوسیت، بت پرستی، دہریت وغیرہ یہ کوئی چیز نہیں جو دہر کو پوج رہے ہیں اصل مراد ان کی بھی یہی ہے کہ کوئی ایسی خفی طاقت ہے جو درحقیقت موثر ہے۔ وہ اس کو دہر کہتے ہیں۔ تم اس کو اللہ کہتے ہو۔ کوئی اس کو گاڈ (GOD) کہتا ہے۔ کوئی رام کہتا ہے۔ کوئی رجم کہتا ہے۔ لہذا سب ایک ہی ہیں۔ یہ شہ بڑا قوی ہے۔ میں اس کا ازالہ کرنے کے لئے تصویر کا دھواں رخ پیش کرتا ہوں۔



☆ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہاں تک تو میں بھی متفق ہوں کہ خواہ کوئی چاند کو پوجے والا ہو یا سورج کو، گائے کو پوجے یا بیل کو، پتھر کو پوجے یا درخت کو۔ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ ان تمام کی پوجا کرنے کا سبب ایک ہی ہے کہ ہر پوجا کرنے والا اپنی اندر کی جو ہری فطرت کی بنا پر مجبور ہے کہ جس اللہ اور جس رب کی محبت کا جو ہر اس کی فطرت میں ہے، اس کی محبت کا جو ہر اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ جس کی محبت میں تڑپ رہا ہے اس کو تلاش کر کے اسے پالے۔ کیوں کہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب مل جائے۔ یہاں تک تو میں کہہ سکتا ہوں کہ چاند کو پوجنے والے مندر میں جانے والے اور مسجد میں جانے والے کسی ایک ہستی کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور اس لئے تلاش کر رہے ہیں کہ خدا کی محبت کا جو ہر ہر فطرت میں موجود ہے اور جب کسی کے دل میں محبت ہو تو ہر محبت والے کو محبت مجبور کرتی ہے کہ محبوب کو تلاش کرے۔

☆ اتنی بات تو آپ سب جانتے ہیں کہ عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ نے سب روحوں کو فرمایا کہ ”اَللّٰهُمَّ بِرَبِّکُمْ“ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ تو سب نے کہا، کیوں نہیں! تو ہمارا رب ہے، سب سے پہلے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف فرمایا اور پھر تمام رسولوں نے، نبیوں نے، صدیقوں نے، شہیدوں نے، صالحین نے، اغواث نے، اقطاب نے، ابدال نے، ندباء نے، نقباء نے، تمام معصومین نے، مومنین نے، مومنات نے، عارفین نے، عارفات نے، سالکین نے، سالکات نے، سب نے کہا ”ہلی“، ”پہلے ہلی“، ”کانہرہ حضور ﷺ نے لگایا۔ پھر حضور ﷺ کے آخر سے پر سب نے ”ہلی“ کانہرہ لگایا اور سب نے کہا کیوں نہیں ضرور تو ہمارا رب ہے اور جب یہ جسم یہاں آیا اور روح اس میں آئی تو روح نے کہا کہ جس کی ربوبیت کا میں نے وہاں اقرار کیا تھا وہ ہے کہاں؟

☆ اب کسی نے چاند کی طرف نظر اٹھا کر تلاش کیا، کسی نے سورج کی طرف نظر اٹھا کے تلاش کیا، کسی نے عناصر میں تلاش کیا، کسی نے پہاڑوں میں تلاش کیا۔ اللہ! بس محبت ہے جو اس کو لے پھرتی ہے جو کبھی آسمانوں کی جستجو کرتی ہے، کبھی زمینوں کی جستجو کرتی ہے، کبھی پانی کی جستجو کرتی ہے اور مجبور کرتی ہے کہ تلاش کرو اس محبوب کو جس کی ربوبیت کا اعتراف کیا ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ محبت تو مجبور کرے گی کہ محبوب کی تلاش کرو لیکن کامیابی ضروری نہیں۔ کامیابی جب ہی ہوگی جب تلاش کا ذریعہ صحیح ہوگا اور اگر تلاش کا ذریعہ غلط ہے تو تلاش جاری رہے مگر کامیابی نہیں ہوگی۔

☆ ایک مثال سنئے کہ ایک پیالی میں چائے رکھی ہے اور آپ کو معلوم نہیں کہ اس میں چینی ہے یا نہیں تو آپ اس کو دیکھتے رہیں تو کیا آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں چینی ہے؟ بالکل معلوم نہیں ہوگا۔ آپ اپنے کان میں ڈالیں کہ شاید چینی کی آواز کان میں آجائے تو آپ کو پتہ نہیں چلے گا۔ آپ اس میں انگلی ڈال کر دیکھتے رہیں کہ بھئی شاید انگلی کو پتہ چل جائے کہ چینی ہے یا نہیں۔ ہزار برس گزر جائیں تلاش جاری رہے گی مگر کامیابی نہیں ہوگی۔ کامیابی اس وقت ہوگی، جب آپ ایک کھونٹ چائے پئیں گے۔ وہ کھونٹ قوتِ ذاتِ اللہ سے مس ہوگا تو قوتِ ذاتِ اللہ بتا دے گی کہ چینی ہے یا نہیں تلاش کا ذریعہ اگر غلط ہوگا تو تلاش جاری رہے گی مگر کامیابی نہیں ہوگی۔

☆ میرے عزیز واپس انسان اپنی فطرت میں خدا کی محبت کا جو ہر لے کر آیا ہے۔ وحدتِ ادیان کے فلسفہ سے یہاں تک تو میں متفق ہوں۔

☆ ہر انسان اسی محبت کے فطری تقاضے کی بنا پر اس رب کو تلاش کر رہا ہے کہ جس کو ”ہلی“ کہہ کر رب مانا ہے، وہ کہاں ہے تو تلاش کا ذریعہ جس نے عقل کو بنایا وہ دہریہ ہو گئے اور جس نے حواس کو ذریعہ بنایا وہ مظاہر پرست ہو گئے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عقل بھی ذریعہ نہیں ہو سکتی، ہاں عقل سے تم میری معرفت کے لئے مدد لے سکتے ہو اور حواس سے بھی تم میری معرفت کے لئے مدد لے سکتے ہو مگر حواس پر بھروسہ نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ ناقص ہیں۔ عقل سے تم کام لے سکتے ہو لیکن اس عقل پر تم بھروسہ نہ کرو، کیوں کہ یہ عقل ناقص ہے۔

☆ ارے میں کامل ہوں، عقل ناقص ہے، میں لامتناہی ہوں، حواس متناہی ہیں، میں لاحدود ہوں۔ اب اگر تم لاحدود کو تلاش کرنے کا ذریعہ محدود کو بنا لو اور لامتناہی کو تلاش کرنے کا ذریعہ متناہی کو بنا لو اور کامل کے لئے ناقص کو ذریعہ بنا لو تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کامیاب وہ ہوگا جس نے صحیح ذریعہ کو اختیار کیا اور وہ نام کام ہوگا جس نے غلط ذریعہ کو اختیار کیا۔ بس اسی دوسرے رخ کو سامنے رکھ لو اور اس اعتراض کا جواب سمجھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور فرمایا

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى

☆ مظاہر کائنات کو دکھو اور ان سے کام لو، ان کو میرے محبوب کی زبان نے دلیل قرار دیا لیکن یاد رکھو کہ اگر تم نے تلاش کرنی ہے تو



ان غلط ذریعوں کے اوپر اعتماد نہ کرو۔ میرے تلاش کرنے کا ذریعہ تمہارے حواس نہیں۔ میں حواس میں نہیں سانسکتا۔ میں تمہاری عقل کے دائرے میں محدود نہیں ہو سکتا۔ اگر مجھے تلاش کرنا ہے اور مجھے پانا ہے تو نہ میں حواس کی دنیا میں لوں گا نہ میں عقل کی دنیا میں لوں گا۔ اگر لوں گا تو محمد مصطفیٰ ﷺ کے واسطے سے لوں گا۔

☆ خدا کی قسم! جس نے محمد مصطفیٰ ﷺ کو چھوڑ دیا۔ اس نے خدا تعالیٰ کو کبھی نہ پایا اور میں تمہیں پھر کہتا ہوں کہ خدا کو تلاش کرنے کا کامیاب ذریعہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات پاک ہے اور محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچنے کا ذریعہ اولیاء اللہ کی ذوات قدسیہ ہیں۔ اولیاء اللہ سے ہٹ کر محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچنا محال ہے اور محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہٹ کر خدا تک پہنچنا محال ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ

## انسانیت کا مرکز توحید اور وسیلہ رسالت ہے

☆ اقوام عالم کی تہذیب و تمدن اور معاشرے میں اصولی اور بنیادی اختلافات کی سب سے بڑی وجہ توحید باری کے عقیدے میں اختلاف کا پایا جانا ہے۔ نئی نوع انسان کو ایک مرکز پر لانے کا کوئی طریقہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ انہیں معبود واحد کی وحدانیت کے اعتقادی مرکز پر جمع کر دیا جائے لیکن فطرت انسانی محض عقل کی روشنی میں اس مرکب وحدت تک پہنچنے میں کسی ایسی دلیل کی محتاج تھی جو صحیح معنی میں اسے منزل مقصود تک پہنچا دے اور تمام نئی نوع انسان کے لئے ایسی کامل اور قطعی دلیل حضرت محمد رسول اللہ کی ذات گرامی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ رسالت توحید کی دلیل ہے اور اس میں شک نہیں کہ مکہ طیبہ لا الہ الا اللہ دعویٰ ہے اور محمد رسول اللہ اس کی دلیل ہے اور اس دلیل کو دعویٰ سے اتنا قرب ہے کہ دونوں کے درمیان واؤ عاطفہ تک کی گنجائش نہیں معلوم ہوا کہ قرب الہی کا ذریعہ صرف قرب مصطفائی ہے اور توحید کا وسیلہ رسالت ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست  
اگر بہ اونہ رسیدی تمام بولہبی است (اقبال)

از علامہ احمد سعید کاظمی مدظلہ

(ماہنامہ السعد لٹرانٹل منی جون ۱۹۶۴ء)

## عبادت واستعانت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
نَحْمَدُكَ يَا خَلْقُ عَالَمِ الْكَوْنِ

☆ گزشتہ جمعہ المبارک کو سورہ فاتحہ کی تفسیر کے سلسلہ میں آیت ”مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ کی مختصر تفسیر عرض کی تھی۔ آج آیت ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

☆ جب عبد مومن اپنے معبود کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس نے اپنے رب کی حمد کی، اس کی ثناء بجالایا، اس کی بزرگی بیان کی۔ یہ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی حمد ہی تو ہے۔ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ اللہ تعالیٰ کی ثناء ہے اور ”مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ اللہ تعالیٰ کی بزرگی کا بیان ہے۔ یہ اللہ کی حمد، اللہ کی ثناء، اللہ کی بزرگی کا بیان، یہ اللہ کی بارگاہ میں عاجزی کے آداب میں شامل ہے۔ یہاں تک وہ اپنے معبود کی بارگاہ میں غائب کے صیغوں سے مخاطب تھا اب اسے اپنے معبود کی بارگاہ میں حاضری کا وہ درجہ حاصل ہوا کہ گویا وہ غیبت سے عیاں کی جانب منتقل ہو گیا اور بے ساختہ کہتا ہے ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ اے اللہ! تو نے مجھے حاضری کا شرف عطا فرما کر غیبت سے عیاں کا مرتبہ عطا فرمایا، اب میں حاضر کے صیغوں سے خطاب کر کے عرض کرتا ہوں ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔



☆ دیکھیے عبادت اور استعانت دونوں اللہ ہی کے ساتھ خاص ہیں۔ اللہ ہی معبود ہے اور ہی مستعان ہے۔ لاریب، لازیب، آمنا و صدقاً، نہ اس کے سوا کوئی معبود ہے اور نہ اس کے سوا کوئی مستعان ہے۔ ”واللہ المستعان“

☆ بعض لوگوں نے عبادت کے معنی میں کچھ افراط و تفریط سے کام لیا۔ یہ سمجھ گئے کہ عبادت کی روح تعظیم ہے۔ اگر تعظیم کا محصول نہ ہو تو عبادت کا کوئی معنی ہی نہیں بنتا۔ یقیناً تعظیم روح عبادت ہے لیکن بعض لوگ ہر تعظیم کو عبادت سمجھنے لگے، یہ غلط ہے۔

☆ دراصل عبادت ”افضی غایۃ الخضوع و النذل“ کا نام ہے۔ یعنی حد درجہ تعظیم و انکسار کا نام عبادت ہے۔ تعظیم کا وہ مقام جس کے آگے تعظیم کا اور کوئی درجہ نہ ہو، اسے ہم بندگی سے عبارت کرتے ہیں اور اسی کو عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے سوا عبادت کا اور کوئی مفہوم نہیں ہے۔

☆ اب ایک تو ہے تعظیم اور ایک ہے ”افضی غایۃ التعظیم“ تو اللہ کے سوا اللہ کے رسول، اللہ کے نبی، اللہ کے مقرب اطہار علیہم السلام، یہ تمام کے تمام تعظیم کے مستحق ہیں، مگر ”افضی غایۃ التعظیم“ کا مستحق فقط اللہ ہے۔ تعظیم رسولوں کے لئے بھی ہے۔ تعظیم نبیوں کے لئے بھی ہے۔ تعظیم ولیوں کے لئے بھی ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان پتھروں کی تعظیم کا بھی حکم دے دیا جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کے بندوں سے ہو گئی۔

☆ دیکھیے، بیت اللہ یعنی کعبہ معظمہ ہے یا نہیں؟ یقیناً معظمہ ہے تو کیا کعبہ معظمہ کے بغیر ہی معظم ہو گیا؟ بھی اس کی تعظیم ہوتی ہے، تبھی تو وہ معظم ہے۔ اب اگر محض تعظیم ہی کو عبادت کہیں گے تو پھر کعبہ بھی معبود ہو گیا۔ حالانکہ کعبہ تو معبود نہیں، وہ تو طاری عبادت کی ایک جہت اللہ نے مقرر کی۔ بعض لوگوں نے یہ غلط فہمی پھیلانی کہ بھئی جہاں جس کی تعظیم کرو گے، بس عبادت ہو جائے گی۔ ادھر تم نے کسی کی تعظیم کی ادھر مشرک ہو گئے۔ بھولے بھالے مسلمانوں کے لئے خواہ مخواہ کی ایک مصیبت کھڑی کی ہوئی ہے۔ جب حرمین طہین کی حاضری ہوتی ہے تو اس کا پورا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ محض تعظیم کو عبادت کہنا بہت زیادتی ہے اور دین میں فتنہ پیدا کرتا ہے۔ صحاح ستہ میں مشہور مجموعہ احادیث ابن ماجہ کی ایک حدیث میرے ذہن میں آ رہی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تعجب کے ساتھ کعبہ اللہ کو فرمایا، اے بیت اللہ! تیری عظمتوں کا کیا کہنا تو بہت ہی عظمتوں والا ہے۔ اے۔

☆ اب اگر محض مطلق تعظیم کو ہی شرک قرار دیتے ہو تو کعبہ کو بھی معظم مت قرار دو۔ اور اگر معظم سمجھتے ہو تو اپنے فتویٰ کے مطابق اسے بھی معبود سمجھو۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مطلق تعظیم کا نام عبادت نہیں ہے۔ بلکہ ”افضی غایۃ التعظیم“ کا نام عبادت ہے۔ یعنی ایسی تعظیم کہ اس کے آگے تعظیم کا کوئی درجہ متصور نہ ہو۔

☆ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا  
 اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ (ب ۲۔ س بقرہ۔ آیت ۱۵۸)  
 ترجمہ ☆ صفا اور مروہ اللہ کی نشانوں میں سے ہیں۔

☆ یعنی جن پتھروں پر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت حاجرہ کے قدم لگ گئے، وہ پتھر بھی معظم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا  
 وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَانْهَا مِنْ تَقْوٰی الْقُلُوْبِ (ب ۱۷۔ س الحج۔ آیت ۳۲)  
 ترجمہ ☆ اور جو اللہ کی نشانوں کی تعظیم بجالا دے تو بے شک یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

☆ یعنی اللہ تعالیٰ سے نسبت اور تعلق رکھنے والی چیزوں کا ادب و احترام بجالانا اور اس کی تعظیم کرنا شرک میں داخل نہیں بلکہ عین توحید کی نشانوں میں سے ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والے لوگ ہی ان چیزوں کی قدر کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف بالواسطہ یا بلاواسطہ منسوب ہیں۔

☆ اب یہ شعائر اللہ جن کی تعظیم کی جاتی ہے، کیا یہ اللہ ہیں؟ اگر شعائر اللہ کو اللہ کہیں گے تو پھر ہزاروں خدا ہو جائیں گے۔ بہر حال شعائر اللہ کی تعظیم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اعلان فرمایا

وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَانْهَا مِنْ تَقْوٰی الْقُلُوْبِ (ب ۱۷۔ س الحج۔ آیت ۳۲)  
 ☆ پتہ چلا کہ مطلقاً تعظیم شرک نہیں بلکہ ”افضی غایۃ التعظیم“ شرک ہے اور کوئی مسلمان ایسی تعظیم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کیلئے نہیں



☆ اے اللہ! تو ہی ہمارا معبود ہے اور ہم تیرے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے۔ ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ کے معنی آپ کی سمجھ میں آگئے۔  
 ”إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ اے اللہ! ہم تجھ ہی سے استعانت کرتے ہیں۔

☆ استعانت کے معنی کیا ہیں؟ میں آپ کو بتا دوں کہ جس طرح ہر عظیم کام عبادت نہیں، اسی طرح ہر مدد طلب کرنے کا نام استعانت نہیں۔ ”إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ میں جس استعانت کا ذکر ہے، وہ ہر استعانت نہیں ہے اور اگر اس سے مراد ہر استعانت ہے تو پھر یہ تو بڑی مصیبت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا

وَقَاوْنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالْقَوَىٰ - (س المائدہ - آیت ۲ - ب ۶)

ترجمہ ☆ یعنی ”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔“

☆ ”قَاوْنُوا“ باب تفاعل سے ہے، اس کے معنی شرکت کے ہوتے ہیں۔ یعنی تم اس کی عون (مدد) کرو۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ ایک کام میں آپ مجھ سے مدد طلب کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے مدد طلب کر سکتا ہوں۔ اب اگر ہر استعانت شرک ہو تو پھر ”وَقَاوْنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالْقَوَىٰ“ کے کیا معنی ہوں گے۔ پھر تو نیکی کے کاموں میں کسی سے مدد طلب کرنا شرک ہو جائے گا۔

☆ حالانکہ قرآن تو اس کا حکم دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ ہر طرح کی عون کو ”إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ کے تحت لانا غلط ہے۔ جیسا کہ ہر عظیم کو ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ کے تحت لانا غلط ہے۔ وہ عظیم خاص ہے، جو ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ کے میں مراد ہے اور وہ استعانت خاص ہے جو ”إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ میں مراد ہے۔ اگر ہم کسی کو مستعان حقیقی سمجھ کر مدد طلب کریں اور ہمارا اعتقاد یہ ہو کہ یہ مدد کرنے میں مستقل بالذات ہے، اس کو کسی کی احتیاج نہیں، یہ خود بخود بغیر کسی کا محکوم ہوئے، بغیر کسی کی مشیت اور ارادہ کے ماتحت ہوتے ہوئے اپنی ذات کے مستقل ہمارے مدد کر سکتا ہے، تو یہ شرک ہے کیونکہ کسی کو مستقل بالذات مستعان سمجھ کر مدد طلب کرنا بھی ”اَقْضَىٰ غَايَةَ الْعَظِيمِ“ ہے اور اسی کو عبادت کہتے ہیں۔

☆ ہمارا ایمان ہے کہ جس سے بھی مدد طلب کرتے ہیں، اس کے متعلق ہمارا کبھی یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ یہ اللہ کے حکم کے بغیر ہماری مدد کرے گا۔ یا اللہ کی مرضی کے بغیر یا مشیت کے بغیر ہماری مدد کرے گا۔ یا اللہ کے ارادے کے بغیر ہماری مدد کرے گا۔ ہمارا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مدد کرنے کی قدرت دی ہے۔ اللہ کی دی ہوئی قدرت سے یہ ہماری مدد کرے گا۔ اللہ کے حکم سے ہماری مدد کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہماری مدد کرے گا۔ اگر اللہ کی مشیت متعلق نہ ہو تو یہ ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ متعلق نہ ہو تو کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ اللہ نے اس کو مستقل بالذات کوئی قوت نہیں دی۔ کیونکہ استقلال ذات الوہیت کا وصف ہے اور الوہیت کا وصف غیر الہ میں نہیں سکتا۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں ”إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ یعنی اے اللہ! ہم تجھے مستعان حقیقی اعتقاد کر کے فقط تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہ ارشاد فرمایا، ”وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ“، سبب اور وسیلہ ایک ہی بات ہے۔ یعنی صبر اور صلوٰۃ، یہ وسیلہ ہیں استعانت کے، استعانت تو اللہ ہی سے ہوگی۔ جس طرح صبر اور صلوٰۃ وسیلہ ہیں، اسی طرح اولیاء کرام بھی وسیلہ ہیں اور جس طرح اعمال صالحہ وسیلہ ہو سکتے ہیں تو جو اعمال صالحہ سے متصف ہیں، وہ بھی وسیلہ ہیں۔ اسی لئے ہم اولیاء اللہ سے توسل کرتے ہیں۔ ہم ان کی ذات کا توسل نہیں کرتے بلکہ ان کے وصف ولایت کی بنا پر توسل کرتے ہیں۔ ان کی صالحیت اور اعمال صالحہ کی بناء پر توسل کرتے ہیں۔ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں نے اعمال صالحہ سے توسل کر کے اللہ سے مدد طلب کی اور اعمال صالحہ سے توسل کرنا یہ بناء ہے صالحین سے توسل کرنے کی، ہم یہی کہتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء کرام و صالحین ہمارے وسیلہ ہیں، ہاں مدد کرنے والا اللہ ہے۔ عسوں فرمانے والا اللہ ہے۔ حاجت بر لانے والا اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے صالحیت کو، اعمال صالحہ کو، نیکی کو، تقویٰ کو، صبر کو، صلوٰۃ کو وسیلہ بنایا اور جو عمل ہیں صبر کے، جو متصف ہیں صلوٰۃ سے اور جو متصف ہیں اعمال صالحہ سے وہ باعتبار اعمال صالحہ کے ہمارا وسیلہ ہیں اور ان سے قطع نظر کر کے محض ان کی ذات کو ہم وسیلہ قرار نہیں دیتے کیونکہ ان کے توسل کا معنی ان کا اعمال صالحہ سے متصف ہونا ہے اور اعمال صالحہ سے توسل یعنی استعانت قرآن سے ثابت ہے، قرآن نے کہا، ”وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ“۔

☆ اب اگر مطلقاً استعانت کو شرک کہو گے تو قرآن کی اس آیت کو کہاں لے جاؤ گے۔ پھر تو صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد طلب کرنا

بھی شرک ہو جائے گا۔ کیونکہ صبر بھی خدا نہیں، صلوٰۃ بھی خدا نہیں ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی عبادتیں ہیں تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب



کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اے اللہ! ہم تجھ ہی کو مستعانِ حقیقی مانتے ہیں۔ اگر تو نہ چاہے تو کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ اگر تیرا ارادہ اور مشیت نہ ہو تو کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔

☆ اب یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ جب یہ اللہ کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے تو ان کا تو کچھ مقام نہ ہوا اور ان کی کوئی فضیلت نہ ہوتی۔

☆ دیکھیے، یہ اللہ کے نیک بندے، اللہ کی مشیت سے ہی تو مدد کر سکتے ہیں۔ بغیر مشیت کے تو مدد نہیں کر سکتے تو پتہ چلا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے ساتھ مشیت الہی متعلق ہوگئی ہے۔ کیا یہ ان کی فضیلت نہیں؟ ان کے ساتھ مشیت الہیہ متعلق ہوتی ہے۔ ارادہ الہیہ متعلق ہوتا ہے تو جو متعلق ہو مشیت الہیہ سے اور جو متعلق ہو ارادہ الہیہ سے، بتائیے کہ وہ فضیلت کامرکز قرار پائے گا یا نہیں؟

☆ یہاں ایک اور شبہ کا ازالہ بھی کر دوں، کہ جب ہم کہتے ہیں، ”إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں تو شبہ یہ ہے کہ اس میں حصر ہے۔ یعنی ہم فقط تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں، تیرے غیر سے نہیں۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے ہم دیکھیں کہ حصر کے معنی کیا ہیں؟ تو عرض ہے کہ حصر کے معنی ہیں ماسواً مذکور کی نفی، مثلاً ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ ہے، اس میں مذکور کو ن ہے؟ ”اللہ“ کیونکہ یہاں اللہ کے سوا ہر ایک سے الوہیت کی نفی ہوگئی اور اللہ کے ماسواً سب غیر مذکور ہیں۔ تو ہر غیر مذکور سے الوہیت کی نفی ہوگئی۔ اب ہم کہتے ہیں ”إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ تو ”إِيَّاكَ“ میں مذکور تو اللہ کی ذات ہے کیونکہ ”إِيَّاكَ“ میں جو ضمیر خطاب ہے، اس کا مصداق اللہ تعالیٰ ہے تو اب مذکور تو فقط اللہ ہے اور غیر کی نفی ہوگئی کیونکہ مذکور کے ماسواً سب کی نفی ہوتی ہے تو پتہ چلا کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور سے استعانت نہیں کر سکتے۔ کسی سے مدد نہیں مانگ سکتے، اللہ سے مدد مانگنا خاص ہے۔ کیونکہ مذکور ہی ہے اور حصر میں ماسوائے مذکور کی نفی ہے لہذا اللہ کے سوا سب ماسواً کی نفی ہوگئی۔ اللہ کے ماسواً جو بھی ہے، اس سے استعانت نہیں ہو سکتی۔

☆ اب سوال یہ ہے کہ فقط مردے ہی اللہ کے ماسواً ہیں؟ کیا زندہ اللہ کے ماسواً نہیں؟ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ جناب مردوں سے مدد مانگنا شرک ہے اور زندوں سے مدد مانگنا جائز ہے۔ ارے خدا کے بندو! ”إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ میں تو حصر ہے اور حصر میں تو ماسوائے مذکور کی نفی ہوتی ہے تو ماسوائے مذکور فقط مردہ ہیں۔ کیا زندہ ماسوائے مذکور نہیں ہیں؟ کیا صرف مردوں کو غیر اللہ کہو گے؟ اور زندوں کو عین اللہ کہو گے؟ خبر نہیں، ان لوگوں کا دماغ کہاں چلا گیا؟

☆ آپ آٹھ سے استعانت کرتے ہیں دیکھنے کے لئے، کان سے استعانت کرتے ہیں سننے کیلئے، زبان سے استعانت کرتے ہیں بولنے کیلئے، ہاتھ سے استعانت کرتے ہیں پکڑنے کیلئے، پاؤں سے استعانت کرتے ہیں چلنے کیلئے، دماغ سے استعانت کرتے ہیں سوچنے کیلئے۔ آپ اپنے دوستوں سے استعانت کرتے ہیں، مقدمات میں وکیلوں سے استعانت کرتے ہیں۔ محکموں میں پولیس سے استعانت کرتے ہیں، کارخانہ کے کاموں میں مالداروں سے استعانت کرتے ہیں۔ کون کی چیز ہے، جس سے استعانت نہیں ہوتی؟ اب بتائیے کہ ماسوائے مذکور میں تو سارے داخل ہیں تو پھر کسی سے بھی استعانت مت کرو اور ہر ایک کی استعانت کو شرک قرار دو۔ جواب میں کہا جاتا ہے کہ بھئی یہ تو زندہ ہیں تو کیا زندہ اللہ ہیں؟

☆ الحمد للہ! ہمارا عقیدہ بالکل صاف ہے، بالکل سچا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی زندہ سے بھی مستعانِ حقیقی سمجھ کر مدد مانگتا ہے تو وہ مشرک ہے، کیونکہ ”إِيَّاكَ“ میں حصر ہے اور حصر میں ماسوائے مذکور کی نفی ہوتی ہے۔ زندہ بھی ماسوائے مذکور ہیں اور مردہ بھی ماسوائے مذکور ہیں۔ اگر کسی فوت شدہ کو مستقل بالذات مان کر مدد مانگو گے، تب بھی مشرک ہو جاؤ گے اور اگر کسی زندہ کو مستقل مستعان بالذات جان کر مدد مانگو گے تو تب بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ اگر استقلالِ ذاتی کا عقیدہ نہیں تو نہ مردہ سے مدد مانگ کر مشرک ہو گے اور نہ زندہ سے مدد مانگ کر مشرک ہو گے۔

☆ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ غیر اللہ سے مانگنا یہ تو اللہ کو عاجز سمجھنا ہے۔ کیا اللہ مدد نہیں کر سکتا؟

☆ بھئی، بندوں سے مدد مانگنا، اگر اللہ کے عاجز و مجبور ہونے کی دلیل ہے تو اللہ بھی بندوں سے مدد مانگتا ہے۔ آپ کہیں گے اللہ کا

مدد مانگنا کہاں ہے؟ میں نہیں کہتا قرآن نے صاف کہا

”إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ“ (س محمد۔ آیت ۷۔ ب ۲۶)

”إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ“ جملہ شرطیہ ہے۔



☆ اللہ فرماتا ہے کہ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔

☆ اب اگر کوئی کہے کہ ہم تو اللہ ہی سے مدد مانگیں گے تو جناب اللہ نے تو اپنی مدد کرنے کو شرط کر دیا، تمہاری مدد کرنے سے، کہ تم میری مدد کرو گے تو بعد کو میں تمہاری مدد کروں گا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جزا شرط کے بعد ہوتی ہے۔ اب آیت کے معنی کیا ہوں گے؟ آیت کے معنی یہ ہوں گے

”إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ أَتَىٰ إِنَّ تَنْصُرُوا دِينَ اللَّهِ فَنُصْرَتُهُ“

ترجمہ ☆ یعنی اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

☆ اب دیکھیے، اللہ اپنے دین کی مدد سے کرا رہا ہے۔ آپ کیوں نہیں کرتا۔ کیا اللہ مجبور ہے؟ ارے بھائی یہ تم سے جو مدد کرا رہا ہے۔ یہ اللہ ہی کا مدد کرنا تو ہے۔ اس طرح اولیاء اللہ کا مدد کرنا، وہ اللہ ہی کا مدد کرنا تو ہے۔ کیونکہ اللہ ہی نے تو مدد کرنے کی طاقت ان کو دی ہے۔ اللہ ہی کا تو حکم متعلق ہے اور اللہ ہی کی مشیت متعلق ہے۔ اگر تمہارا مدد کرنا اللہ کا مدد کرنا ہے تو ہر ولی کا مدد کرنا بھی اللہ کا مدد کرنا ہے۔

☆ بہر حال ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ بالکل واضح ہے اور ”إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ بالکل واضح ہے۔ ہمارا معبود بھی وہی ہے اور ہمارا مستعان حقیقی بھی وہی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

☆ تقدیم مقبول مفید دھر ہے۔ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ تیرے غیر کی نہ عبادت کرتے ہیں اور نہ تیرے غیر سے مدد چاہتے ہیں۔ عبادت کے معنی ہیں بندگی۔ بندگی کا مفہوم ہے، غایت تذل اور خشوع و خضوع، دوسرے لفظوں میں غایت تعظیم سے بھی اسے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جس کا تعلق محض اعتقاد سے ہے۔ بعض لوگ عبادت کے معنی میں اعتقاد کو شامل نہیں کرتے، بلکہ محض اعمال کو عبادت قرار دیتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اگر عبادت کے معنی میں اعتقاد کا اعتبار نہ کیا جائے اور محض عمل کو عبادت قرار دے دیا جائے تو سجدہ تحیت و تعظیم اور سجدہ عبادت سب کا ایک ہی حکم ہو، کیونکہ ہر صورت میں عمل صرف سجدہ ہے۔ لیکن بالا جماع غیر اللہ کے لئے سجدہ تحیت و تعظیم محض ناجائز و حرام ہیں اور سجدہ عبادت شرک خالص ہے۔ یہ فرق نیت اور اعتقاد کے بغیر نہیں نکل سکتا۔ بہت ہوا کہ عبادت اعتقاد قلبی کے بغیر نہیں ہوتی۔ رہا فقہاء کرام کا بعض اعمال کو غیر اللہ کی عبادت قرار دے کر حکم کفیر جاری کرنا، تو یاد رہے کہ وہ کفیر فقہی ہے، کلامی نہیں، فقہاء کی بحث عمل سے ہوتی ہے۔ اعتقاد ان کا بحث نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی تعظیم اس کی عبادت نہیں، بلکہ غایت تعظیم عبادت ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا،

وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ

☆ جب شعائر اللہ کی تعظیم ان کی عبادت کے بجائے قلوب کا تقویٰ ہے تو اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے تو یقیناً صحیح اور درست ہوگا۔

## استحقاق عبادت

☆ پوجا، بندگی، غایت تعظیم انتہائے تذل و خشوع و خضوع اور عبادت کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو اپنے وجود میں مستقل بالذات ہو، کسی کا محتاج نہ ہو۔ جس کا وجود واجب بالذات ہوگا، وہ اپنے ہر کمال اور اپنی ہر صفت میں بھی استقلال ذاتی سے متصف ہوگا۔ یعنی اس کا کوئی کمال اور کوئی صفت کسی کی دی ہوئی نہ ہوگی بلکہ اس کے تمام کمالات و صفات، مقتضائے ذات ہوں گے۔ جو موجود یہ شان نہیں رکھتا وہ عبادت کے لائق نہیں ہو سکتا۔

☆ ظاہر ہے کہ یہ شان صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ وہی واجب الوجود ہے اور اپنے ہر کمال میں مستقل بالذات ہے۔ لہذا عبادت کے

قابل وہی اور صرف وہی ہے۔ اسکے سوائے کسی کو معبود ٹھہرانا کو یا اسے واجب الوجود اور ہر صفت میں مستقل بالذات ماننا ہے۔ اگرچہ

اس ماسوکی اللہ کو معبود ٹھہرانے والا اس کے حق میں وجوب وجود اور استقلال ذاتی کا عقیدہ نہ رکھتا ہو، لیکن جب وہ اسے الہ اور معبود سمجھتا

ہے تو کو یا وہ اسے واجب الوجود مستقل بالذات بھی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ معبود برحق کا ان صفات سے متصف نہ ہونا عقلاً اور شرعاً ہر طرح



محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو شرک قرار دیا جو اپنے باطل معبودوں یعنی بتوں کو اپنے ہاتھوں سے تراش کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ کہ باوجود انہیں مخلوق تسلیم کرنے کے بھی انہیں معبود ماننے تھے۔ مخلوق کا معبود ہونا عقل و شرع کی رو سے قطعاً محال اور ممنوع ہے اور شرک ہمیشہ امر ممنوع لذائذ کا اعتقاد ہی ہوا کرتا ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس محال عقلی کے معقیدین کو شرک قرار دیا۔

☆ استعانت کے معنی ہیں طلب عون یعنی مدد مانگنا، جس طرح عبادت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی، اسی طرح استعانت بھی اسی معبود حقیقی کے ساتھ خاص ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عبادت میں حقیقی مجازی کی تفسیر محال اور یہاں ممکن بلکہ واقع ہے۔ یعنی معبود مجازی محال ہے اور مستعان مجازی ممکن، بلکہ واقع ہے۔

☆ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ استحقاق عبادت کیلئے استقلال ذاتی شرط ہے۔ جب استقلال ذاتی غیر کے حق میں متصور نہیں تو غیر کی معبودیت کسی اعتبار سے ممکن نہیں، البتہ استعانت میں دو پہلو نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مستعان مستقل بالذات ہو، دوسرے یہ کہ اسے کسی کی مدد کرنیکی قدرت غیر مستقلہ خدا کی طرف سے عطا کجائے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کسی بندے کو غیر مستقل قدرت عطا کر دے اور جو چیز تحت قدرت ہو وہ ممکن بالذات ہوتی ہے۔ اور کسی امر ممکن کا اعتقاد کسی صورت میں شرک نہیں ہو سکتا۔

☆ بعض لوگ اللہ کے مقبول بندوں کو قضاے حاجات کا وسیلہ بنانا بھی شرک سمجھتے ہیں، وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی سخت غلطی پر ہیں، جن کے نزدیک خدا تعالیٰ کے محبوب بندوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی قدرت غیر مستقلہ کا اعتقاد بھی شرک ہے۔ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ جب تک کسی امر ممنوع لذائذ کا اعتقاد نہ ہو شرک نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ کسی کا وسیلہ ہونا ممکن ہے۔ اسی طرح قدرت غیر مستقلہ کی عطا بھی محال نہیں تو ایسی صورت میں یہ دونوں اعتقاد کیسے شرک ہو سکتے ہیں۔ ہاں، البتہ عطاے الوہیت اور قدرت مستقلہ کا دینا اعتقاد محال ہے۔ اس لئے جو شخص کسی مخلوق کے حق میں یہ اعتقاد رکھے گا کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ نے اس کو الوہیت کا درجہ عطا کر دیا، مستقل قدرت دے دی، وہ قطعاً شرک قرار پائے گا۔ کیونکہ اس نے ایک ایسے امر کا اعتقاد کیا، جو عقلاً اور شرعاً ہر طرح محال اور ممنوع بالذات ہے۔

☆ ہمارے اس بیان سے وہ تمام شکوک و شبہات رفع ہو گئے جنہیں بعض لوگ ناجبجی کی وجہ سے پیش کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ قضاے حاجات میں کسی بزرگ کو خدا کے دربار میں وسیلہ بنانا اس لئے شرک ہے کہ مشرکین عرب بھی اپنے بتوں کو خدا کے دربار میں وسیلہ بناتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی شرک قرار دیا۔

☆ اس کا ازالہ ہمارے بیان سے ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو کھنکھاس لئے شرک قرار نہیں دیا کہ وہ اپنے بتوں کو اللہ کے دربار میں وسیلہ سمجھتے ہیں (اگرچہ پتھر کے بتوں کو وسیلہ سمجھنا عقل سلیم کی روشنی میں قطعاً محال ہے) بلکہ انہیں اس لئے شرک قرار دیا کہ وہ ان کی عبادت کرتے تھے۔ کسی چیز کو وسیلہ قرار دے کر اس کی عبادت کرنا یقیناً شرک ہے۔ یعنی وسیلہ بنانا شرک نہیں بلکہ اس کی عبادت کرنا شرک ہے۔ مشرکین عرب کا اپنے بتوں کی عبادت کرنا، اسی آیت میں مذکور ہے جس میں ان کے وسیلہ بنانے کا ذکر ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے ان کا مقولہ اس طرح بیان فرمایا

وَمَا تَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ

ترجمہ ☆ ہم ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔

☆ بے شک بتوں کا مقرب الی اللہ ہونا قطعاً باطل ہے لیکن مدار شرک ان کی عبادت پر ہے، تو سب پر نہیں۔

☆ نظام عالم پر غور کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس جہان کا پورا نظم و نسق مخلوق کے باہم امداد و اعانت پر چل رہا ہے ایک کو دوسرے سے فائدہ پہنچانا اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا کو یا قانون فطرت ہے۔ کیونکہ زمین سے لے کر آسمان تک، موجودات کائنات میں ارتباط پایا جاتا ہے۔ اس قانون کے بغیر ممکن نہیں، بالخصوص بنی نوع انسان کا گزارہ تو اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اگر کسی مخلوق سے مدد لینا ناجائز ہو تو انسانی معاشرہ درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

☆ مثال کے طور پر انسان کے ایک فرد کو پیچھے اور دیکھیے کہ اس کی ضروریات زندگی کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے اس کی



ولادت پر نظر کیجئے کہ والدین کے بغیر پیدا نہیں ہوا۔ پیدائش کے بعد اس کی تربیت والدین اور دیگر افراد سے متعلق ہے۔ وہ اپنی غذا، لباس، رہائش و دیگر امور میں بے شمار چیزوں کا محتاج اور لاتعداد افراد کا مہربان منت ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے سے تک بلکہ پیدائش سے موت تک اور مہمہ یعنی کودے لے کر لکھ تک ہر مرحلے پر دوسروں کی امداد و اعانت سے وابستہ ہے۔

☆ اس کو غذا کیلئے غلہ کی ضرورت ہے۔ لباس کیلئے کپڑے اور جوتے کی حاجت ہے۔ بیمار ہو جائے تو علاج کیلئے طبیعوں، ڈاکٹروں اور دواؤں کا محتاج ہے۔ رہنے کے لئے مکان اور اسکی تعمیر کیلئے کارکنوں اور مزدوروں کی ضرورت ہے۔ غلہ کی پیداوار کا شکاروں کے عمل سے متعلق ہے، آٹا پیسنے کے لئے چکی اور روٹی پکانے کے لئے باورچی کی ضرورت ہے اور کپڑا سینے کے لئے درزی کی حاجت ہے۔ جوتے کے لئے چمڑا اور چمڑے سے جوتا بنانے کے لئے کارکن کا ہونا لازمی ہے۔ دواؤں کے حصول کے لئے ہر مرحلہ پر سینکڑوں قسم کے کارکنوں کی ضرورت درپیش ہے۔ چلنے کے لئے زمین، سانس لینے کے لئے ہوا، پیاس بجھانے کے لئے پانی، گرمی حاصل کرنے کے لئے آگ اور اسی طرح بقیہ ضروریات اجتماعی نظام کے ماتحت بے شمار افراد کی امداد و اعانت پر موقوف ہیں۔ کوئی شخص کسی کو ایک خط لکھنا چاہے تو ہزاروں افراد کی مدد اور اعانت کو حاصل کئے بغیر وہ خط نہیں لکھ سکتا۔ قلم کی تیاری، روشنائی اور کاغذ کا وجود کتنے مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچتا ہے۔ چاند سورج کی شعاعیں، شب و روز کا اختلاف، ستاروں کی گردشیں، نظام کائنات اور انسانی زندگی پر اس قدر اثر انداز ہیں کہ محتاج بیان نہیں۔ صرف زندگی نہیں بلکہ موت کے بعد بھی اس کو قبر کی منزل تک انسانوں کی مدد درکار ہے۔

☆ یہ تو ظاہری اعتبار سے کہا گیا، اس سے آگے بڑھ کر باطنی اور معنوی حیثیت سے نظر کیجئے تو مخلوقات کی اس مدد و اعانت کا سلسلہ اس سے بھی آگے پہنچتا ہے۔ مثلاً اندائے روح کیلئے ایک علیحدہ روحانی نظام ہے، جس کی احتیاج سے کوئی فرد خالی نہیں ہو سکتا۔ قریب خداوندی اور معرفت الہی کا حصول جو عین مقصد تخلیق انسانی ہے۔ انبیاء و رسل کرام علیہم السلام کی ذوات قدسیہ سے وابستہ ہے۔

☆ عبادات و معاملات و دیگر احکام شرعیہ و مسائل دینیہ وحی ربانی و تعلیمات نبوی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اگر اس اجمال کی تفصیل کی جائے تو احتیاج کے دامن کی وسعت اور اس کے پورا ہونے میں افراد کائنات سے حصول نفع اور باہم امداد و اعانت کا اتنا طویل اور وسیع سلسلہ سامنے آ جاتا ہے، جس کا احصاء ممکن نہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ کسی مخلوق سے نفع و ضرر کا عقیدہ رکھنا یا غیر اللہ سے امداد و اعانت طلب کرنا شرک و کفر ہے، انتہائی مضحکہ خیز اور لالچ نہیں تو اور کیا ہے؟

☆ ہاں، اس میں شک نہیں کہ جس چیز میں جس نفع کی صلاحیت نہ ہو، اس سے اس نفع کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا لغو اور بے ہودگی ہے۔ مثلاً زہر سے تریاق کے نفع کی امید رکھنا، آگ سے پانی کا کام لینا، جہل سے حصول علم کی توقع قائم کرنا، قطعاً خلاف عقل و دانش ہے۔ اسی طرح جس شخص کو جس کام کی قدرت خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا نہیں ہوئی، اس سے وہ کام لینا یقیناً حماقت ہے۔ لیکن ایسے شخص کو بلا دلیل شرعی مطلقاً کافر و شرک کہہ دینا بھی سراسر حماقت و جہالت ہے۔

☆ خلاصہ یہ کہ غیر اللہ سے مدد لینا، اس مدد کے جواز کا عقیدہ رکھنا، اسی وقت کفر و شرک قرار پا سکتا ہے، جب کہ اس غیر اللہ کو مستقل بالذات مانے اور اقصیٰ غایت تعظیم کا عقیدہ اس کے حق میں رکھے اور جب کہ کوئی ظہر عن الہی تسلیم کرے اور استقلال ذاتی کی اس سے نفی کرتے ہوئے اسکی امداد و اعانت کا عقیدہ رکھا جائے اور اسی اعتقاد کیساتھ اس سے مدد طلب کی جائے تو ہرگز کفر و شرک نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کام کا اہل نہ ہو اور اس وجہ سے یہ مدد مانگنا لغو اور بے ہودہ قرار پائے۔ مگر اس کو کفر و شرک کہنا یقیناً باطل ہوگا۔

☆ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی کو مظہر عن الہی تسلیم کر لیا جائے اور اس کے حق میں الوہیت یا لوازم الوہیت کا کوئی عقیدہ نہ ہو تو اس کی مدد اور اعانت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی امداد و اعانت ہوگی، جو کہ ”إِنَّا كُنَّا نَسْتَعِينُ“ کی مدلول ہے۔

## مقام نبوت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
نَحْمَدُكَ وَنُكَلِّمُكَ غُلُو رَسُولِهِ الْكَرِيمِ



☆ محترم عزیز و انبی وہ مقدس انسان ہے، جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ منصب ہدیٰ اور اپنے احکام کی تبلیغ کے لئے اپنے بندوں کی طرف بھیجے اور اس منصب ہدیٰ اور منصب تبلیغ احکام پر فائز اور مامور فرمائے۔

☆ علمائے علم لغت نے لفظ ”نمی“ کے آٹھ معنی لکھے ہیں۔ پہلے میں تھوئی معنی عرض کروں گا۔ اس کے بعد یہ عرض کروں گا کہ وہ تمام معنی شریعی میں پائے جاتے ہیں۔ علمائے علم لغت نے فرمایا

۱. النَّبِيُّ ۲. الْمُخْبِرُ ۳. الطَّرِيقُ الْوَاضِحُ ۴. الْخَارِجُ
۵. الْمُخْرَجُ ۶. الظَّاهِرُ ۷. السَّمِيعُ الصَّوْتِ الْخَفِيِّ ۸. الْمَرْتَفَعُ

☆ لفظ نمی کے یہ آٹھ معنی علمائے علم لغت نے لکھے ہیں اور جس مقدس انسان کو اصطلاح شرع میں نمی کہا جاتا ہے اور جس کا مفہوم میں نہایت مختصر الفاظ میں عرض کر چکا ہوں، اس میں یہ آٹھوں معنی لغت کے پائے جاتے ہیں۔

☆ نمی کو ”مُخْبِر“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ہدایات الہیہ اور نجات دہانہ کی راہ کی خبر اللہ کے بندوں کو دیتا ہے۔

☆ نمی کو ”مُخْبِر“ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دیا جاتا ہے۔ نمی کو ”الطَّرِيقُ الْوَاضِحُ“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ چونکہ انسان کے مقصد تخلیق کی تکمیل کے لئے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوتی ہے اور انسان کی تخلیق کا جو بنیادی مقصد ہے، وہ خدا کی معرفت اور خدا تک پہنچنا ہے، دینی و دنیوی سعادتیں حاصل کرنا اور نجات اخروی پانامیہ نمی کی بعثت کا مقصد ہوتا ہے تو کیا ان مقاصد کے حصول کے لئے طریق واضح اور روشن راستہ ہے۔ نمی کی ذات دنیوی سعادتیں اور نجات اخروی حاصل کرنے کا روشن راستہ ہے، نمی خدا تک پہنچنے کا روشن راستہ ہے۔ اس لئے ”الطَّرِيقُ الْوَاضِحُ“ کے معنی بھی نمی شریعی میں پائے جاتے ہیں۔

☆ ”الْخَارِجُ“ کے معنی ہیں ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جانے والا، چونکہ نمی صاحب ہجرت ہوتا ہے اور ہجرت کے معنی آپ جانتے ہیں کہ ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جانا، جیسے ہمارے آقا محمد رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ سے چل کر مدینہ منورہ پہنچے، اس میں خارج ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ یعنی ہجرت کا مفہوم اس میں پایا جاتا ہے۔

☆ نمی کو ”الْمُخْرَجُ“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ چونکہ نمی اعدائے دین کی ایذا رسانی کی وجہ سے ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جاتا ہے اور وہ کفار سبب ہوتے ہیں نمی کے ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ منتقل ہونے کا تو اس اعتبار سے نمی کو ”مُخْرَجُ“ بھی کہا جاسکتا ہے۔

☆ نمی کو ”الظَّاهِرُ“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نمی کو وہ علامات نبوت عطا فرماتا ہے اور وہ آیات نبوت اور معجزات عطا فرماتا ہے کہ نمی جن کا حامل ہو کر کمال ظہور کی صفت کے ساتھ متصف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا

يُخْرِقُونَ كَمَا يُخْرِقُونَ أَنْبَاءَهُمْ

☆ تو اس کمال ظہور کی صفت کے ساتھ متصف ہونے سے نمی شریعی میں ”الظَّاهِرُ“ کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔

☆ نمی شریعی میں ”السَّمِيعُ الصَّوْتِ الْخَفِيِّ“ کے معنی بھی موجود ہیں۔ کیونکہ ”السَّمِيعُ الصَّوْتِ الْخَفِيِّ“ کا مفہوم یہ ہے کہ ہلکی سے ہلکی اور پوشیدہ سے پوشیدہ آواز سننے والا۔ آپ کو معلوم ہے کہ نمی، اللہ کا خطاب سنتا ہے، اللہ کا کلام سنتا ہے، اللہ کی وحی سنتا ہے۔ وہ ایسی ہلکی اور ایسی خفی ہوتی ہے کہ جس تک نمی کا ہی ادراک پہنچ سکتا ہے اور نمی کی ہی قوت سامعہ اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ دوسروں کی قوت اس کے ادراک سے عاجز ہوتی ہے۔ بلکہ اس دنیا میں بھی ہلکی سے ہلکی آواز سننا یہ نمی کی شان ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا کہ جب سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر وادی نملہ سے گزر رہے تھے چیونٹیوں کی ملکہ نے دیکھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر آسمان کی بلندیوں پر آ رہا ہے۔ اگر یہ لشکر یہاں اتر گیا تو یہ جو میری چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں ہیں، یہ اس لشکر کے اترنے سے پامال ہو جائیں گی۔ تو چیونٹیوں کی ملکہ نے چیونٹیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اے میری چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں! تم اپنے سوراخوں میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر اتر کر تمہیں پامال کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ”فَتَبَسَّمْ طَائِفًا مِّنْ قَوْلِهَا“ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام چیونٹیوں کی ملکہ کی بات سن کر مسکرا پڑے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بہت فاصلے اور بلندیوں پر تھے اور چیونٹیوں کی ملکہ چیونٹیوں سے یہ بات زمین پر کہہ رہی تھی۔ اب دیکھیے کوئی



انسان زمین پر موجود ہوتا ہے کیونکہ اس کی آواز نہیں سنتا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اتنی بلند یوں سے اس کی آواز کو سن لیا تو ثابت ہوا کہ ”اَلْصَّامُ الصُّوتِ الْخَفِيِّ“ کے معنی بھی نبی شری میں پائے جاتے ہیں اور ”اَلنَّبِيُّ“ کے معنی ہیں ”اَلْمُرْتَفَعُ“ رفعت اور بلند یوں والا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی ساری کائنات سے بلند ہوتا ہے۔ وہ اپنے علم کے اعتبار سے، اپنے عمل کے اعتبار سے اور اپنے اخلاق کے اعتبار سے بلکہ یوں کہے کہ نبی جسمانی اور روحانی اعتبار سے ساری کائنات سے بلند ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو وہ رفعت اور بلندی عطا فرماتا ہے جو کائنات میں کسی اور کے لئے متصور نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا، ”وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ“ (سورۃ الانشراح) اے محبوب! آپ کو اتنی رفعت عطا فرمائی گئی ہے کہ ہم نے آپ کے ذکر کو بھی آپ کیلئے بلند فرمایا۔ بہر حال یہ آٹھ معنی نبی شری میں پائے جاتے ہیں اور یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ نبی اپنے کمالات علمیہ اور عملیہ کے اعتبار سے تمام غیر انبیاء سے فائق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی کو وہ علم عطا فرماتا ہے جو غیر نبی کے لئے متصور نہیں۔ نبی کو وہ حکمت دیتا ہے جو کسی غیر نبی کیلئے متصور نہیں۔ نبی کے جسمانی قوی دوسرے انسانوں کے جسمانی قوی سے بہت بلند والا قوی ہوتے ہیں۔ نبی کے روحانی قوی، نبی کا علم، نبی کی عقل تمام انسانوں سے بلند والا اور اعلیٰ اور اتم ہوتی ہے۔

☆ آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی حکمت تو تخلیق انسانی کے مقصد کی تکمیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“ (سورۃ الزاریات آیت ۵۶) ہم نے جن وانس کو اپنی عبادت و معرفت کے لئے پیدا کیا ہے۔ عبادت کا مفہوم یہی نہیں کہ ہم پانچ وقت نمازی پڑھ لیں یا روزہ رکھ لیں یا زکوٰۃ دے دیں یا حج کر لیں۔ بلکہ انسان کی عبادت تو ہر سانس میں ہے۔ وہ جو سانس لے، جو عمل کرے، جو حرکت کرے، اس کے اندر اپنے رب کی رضا مقصود ہو جو کام بھی رضا ہے۔ لے لیا جائے اور وہ کام ایسا ہو کہ جس کام کے کرنے کا طریقہ شرع شریف سے ثابت ہے، وہ سب کام عبادت ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کا کھانا کھانا بھی عبادت ہے۔ پانی پینا بھی عبادت ہے، اپنے اہل و عیال کے حقوق متعلقہ کا پورا کرنا، یہ سب عبادت ہے۔ چنانچہ پھر بھی عبادت ہے۔

☆ تو اب غور فرمائیے کہ انسان اپنی زندگی میں جتنے مرحلوں سے گزرے گا، وہ سب عبادت کے مرحلے ہیں۔ اب اسکو معلوم نہیں کہ کس طریقے سے میں اپنے رب کو راضی کروں اور کس طرح میں بات کروں اور کس طرح میں کوئی کام کروں اور میں اللہ تعالیٰ کی رضا کس طرح حاصل کروں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے رب سے اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ کوئی احکام نہیں لے سکتا، کوئی ہدایات نہیں لے سکتا اور کوئی حکم اپنے رب سے وہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اسلئے کہ اس کے اندر کچھ ایسی بشری کمزوریاں ہیں کہ جن کمزوریوں کی وجہ سے وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے فیض حاصل نہیں کر سکتا۔ تو اب اگر اس کو کوئی فیض نہ پہنچے اور اس کو کوئی ایسا طریقہ حاصل نہ ہو، جس کی بنا پر وہ اپنے اس مقصد تخلیق میں کامیاب ہو تو کس طرح وہ کامیابی حاصل کرے گا اور وہ کیا کرے گا۔

☆ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مقصد تخلیق کی تکمیل کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا۔ اب وہ انبیاء بھی اگر انہی بشری کمزوریوں میں مبتلا ہوں تو پھر ان کی نبوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جسمانی قوی عام انسانی قوی سے بہت بلند والا اور قوی ہوتے ہیں۔ ان کی روحانیت بہت عظیم ہوتی ہے۔ ان کا علم بہت کمال ہوتا ہے۔ ان کی حکمت کمال ہوتی ہے۔ ان کے اخلاق اخلاق عظیمہ ہوتے ہیں، ان کا ہر قول، ان کا ہر فعل نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے شرع کی دلیل اور منجانب اللہ ہے۔ اسی لئے اللہ نے فرمایا، ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ (سورۃ الاحزاب آیت ۲۱) اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ”قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ“ (سورۃ آل عمران آیت ۳۱) اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرے محبوب! آپ فرما دیجئے کہ تم میری اتباع کرو اور اسی قرآن میں فرمایا، ”اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولٰٓئِیْ الْاَمْرِ مِنْكُمْ“ (پ: ۵، ص: النساء، آیت: ۵۹)

☆ اگرچہ یہاں اللہ و رسول اور ”اُولٰٓئِی الْاَمْرِ“ تینوں کی اطاعت کا ذکر ہے لیکن اللہ کی اطاعت کے لئے ”اَطِيعُوا“ کا لفظ فرمایا اور رسول کی اطاعت کے لئے بھی ”اَطِيعُوا“ کا لفظ فرمایا اور ”اُولٰٓئِی الْاَمْرِ“ کا عطف کر دیا ماقبل پر۔ وہاں ”اَطِيعُوا“ کا لفظ ذکر نہیں فرمایا۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ ”اُولٰٓئِی الْاَمْرِ“ کی اطاعت تو اسی بات میں ہوگی جو خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہو اور جو بات کسی غیر رسول کی خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہو تو ہرگز اس میں اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی اور جب بھی کوئی غیر رسول کوئی حکم صادرے سامنے رکھے گا تو ہمیں حق ہے کہ ہم ان کے حکم کے صحیح ہونے اور اس کی اطاعت کے واجب ہونے پر ہم اس سے دلیل طلب کر لیں۔ اگر اس کا



عقلم صحیح ہے اور اس کے پاس اس حکم کے واجب الاتباع ہونے کی دلیل موجود ہے تو ہم اس کی اطاعت کریں گے اور اگر وہ حکم صحیح نہیں ہے اور اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو پھر ہم اس کی اتباع نہیں کریں گے اور اسی لئے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق

☆ یعنی ایسی بات میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہو سکتی جس میں خالق کی معصیت ہو تو اس لئے ”أُولَى الْأَمْرِ“ کے لئے مستقلاً ”أَطِيعُوا“ کا حکم نہیں فرمایا بلکہ اس کا عطف ماقبل پر فرمادیا اور دونوں کے لئے فرمایا، ”أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ“ حالانکہ ”الرَّسُولُ“ میں بھی ”أَطِيعُوا“ کی بجائے عطف کیا جاسکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے وہاں ”أَطِيعُوا“ فرمایا۔ یہ کیوں؟ مقصد یہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ کے حکم پر ہم کوئی دلیل طلب نہیں کر سکتے۔ بغیر طلب دلیل کے ہم پر واجب ہے کہ خدا کی اطاعت کرو اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب رسول عام بشری کمزوریوں سے بالاتر ہو اور اگر اس کے اندر وہ بشری کمزوریاں ہیں اور اگر وہ غلطی کرتا ہے، اگر وہ گنہگار ہو سکتا ہے اور وہ اس قسم کی بشری کمزوریوں سے متصف ہو سکتا ہے تو پھر اس کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس کی اطاعت کا واجب الاتباع ہونا، یہ متصور ہی نہیں ہوتا۔

☆ میں آپ کو بتاؤں کہ اللہ کی اطاعت بھی مستقلاً ہے اور رسول کی اطاعت بھی مستقلاً ہے۔ مگر یہ مستقلاً اس معنی میں نہیں ہے کہ خدا کی طرح معاذ اللہ، رسول بھی معبود ہوتا ہے۔ اللہ کا رسول معبود نہیں ہوتا، وہ تو عبد ہوتا ہے، وہ مخلوق ہوتا ہے، خالق نہیں ہوتا، وہ تو خدا نہیں ہوتا خدا انما ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس طرح اللہ کے حکم پر ہم کوئی دلیل طلب کرنے کا حق نہیں رکھتے، اسی طرح رسول کے حکم پر بھی ہم کوئی دلیل طلب کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ اس اعتبار سے ہم رسول کی اطاعت کو مستقل کہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حکم تو رسول کا اپنا ذاتی ہو گا ہی نہیں، وہ تو اللہ ہی کا حکم ہو گا۔

☆ اللہ تعالیٰ کا حکم ہمیں رسول کی زبان سے ملے گا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول ہونے کی حیثیت سے رسول جو کچھ کہے گا اور وہ شرح کی دلیل قرار پائے گا۔ اسی لئے ہم رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو حجت شرعیہ سمجھتے ہیں اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ قرآن میں سب کچھ ہے مگر اس کی وضاحت حدیث میں ہے اور حدیث میں بھی سب کچھ ہے۔ مگر اس کی وضاحت مجتہدین اور فقہاء کے اجتہادات میں ہے اور ان کی فقہ میں ہے۔ جس طرح کہ قرآن کا فہم اور قرآن پر عمل حدیث کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح احادیث کا فہم اور احادیث پر عمل کرنا، یہ فقہاء اور مجتہدین کے اجتہادات اور ان کی فقہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو اس وقت اتنا موقع نہیں کہ میں ان تفصیلات میں جاؤں۔ میں نے اجمالی طور پر آپ کی خدمت میں عرض کر دیا ہے۔ بہر حال، مجھے بتانا یہ تھا کہ نبی عام بشری کمزوریوں سے بالکل پاک ہوتا ہے اور نبی بشر ضرور ہوتا ہے مگر وہ بے عیب بشر ہوتا ہے۔ نبی عبد ضرور ہوتا ہے مگر ایسا عبد ہوتا ہے کہ جو تمام عباد اللہ میں ممتاز، جب سے افضل اور اعلیٰ ہوتا ہے بلکہ وہ ایک ایسا عبد ہوتا ہے کہ جو اللہ اور عباد اللہ کے درمیان واسطہ ہوتا ہے اور وہ آئینہ ہوتا ہے حسن الوہیت کا اور میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے انعام کی جو ابتداء ہوتی ہے، وہ انبیاء سے ہوتی ہے۔ اسی لئے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ

☆ جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء اور نیک لوگ۔ (س: النساء، پ: ۵، آیت: ۶۹)

☆ کیونکہ نبوت پہلا انعام ہے اور نبوت سے صدیقیت کا ظہور ہو گا اور صدیقیت سے پھر شہادت اور صالحیت کا ظہور ہو گا۔ مجھے کہنے دیجئے کہ یہ صالحیت ہو یا شہادت یا صدیقیت ہو، یہ سب نبوت کا حسن ہیں اور نبوت کا مہیا یہ الوہیت کا حسن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو اپنے حسن الوہیت کا آئینہ بنایا۔ اللہ کے کلام کا جلوہ اللہ کے نبی کی ذات میں نظر آتا ہے۔ جب تک اللہ کا کلام، اللہ کا نبی نہیں نہ سنا ہے ہمیں اللہ کے کلام کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ اللہ اپنے علم کا جلوہ اپنے نبی کو دیتا ہے، اپنی قدرت کا منظر اپنے نبی کو بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے جلوے اپنے نبی کو عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام نیکیاں اور خوبیاں اور تمام اوصاف حسنہ اور تمام کمالات کا آئینہ اپنے نبی کو بناتا ہے۔ پھر اس نبی سے ظہور ہوتا ہے تو صدیقین کا جلوہ سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حسن الوہیت کے جلوے ہمیں انبیاء میں نظر آتے ہیں اور نبوت کے حسن کے جلوے ہمیں صدیقین میں نظر آتے ہیں۔

☆ صدیقیت کا کمال، شہادت کا کمال اور صالحیت کا کمال، ان سب آئینوں میں جو ہم دیکھ رہے ہیں، خدا کی قسم! ان سب کا منہا نبوت کا مقام ہے اور نبوت اور



کمالِ نبوت کا جو منہا ہے، وہ ہمارا گواہِ الوہیت ہے۔

☆ بہرِ نوع مجھے کہئے دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے نئی کواہنی صفت عطا فرمائی کہ جس صفت کی بنا پر وہ تمام کائنات میں ممتاز ہے۔ نئی کوحذا سمجھنا یا خدا کا شریک سمجھنا یا خدا کا بیٹا سمجھنا شرک ہے۔ کوئی مسلمان اس کا قائل نہیں ہے۔ نئی خدا نہیں ہوتا۔ خدا انما ہوتا ہے یعنی خدا کے احکام کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ خدا کی معرفت عطا فرماتا ہے۔ نئی واجب الوجود نہیں ہوتا۔ وہ ممکن ہوتا ہے، نئی قدیم نہیں ہوتا، وہ حادث ہوتا ہے۔ نئی خالق نہیں ہوتا بلکہ وہ مخلوق ہوتا ہے اور نئی معبود نہیں ہوتا بلکہ وہ عبد ہوتا ہے۔ مگر ایسا عبد کہ تمام عباد میں ممتاز اور ایسا بشر کہ تمام بنی نوع بشر سے ممتاز، بے عیب اور بے نقص، تو اللہ تعالیٰ نبوت کے لئے ایک ایسے مقدس انسان کو منتخب فرماتا ہے جو کمالاتِ انسانیت سے متصف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تمام علمی اور عملی استعداد کو پیدا فرما دیتا ہے اور اسلئے قرآن کریم میں ایک اور مقام پر فرمایا:

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (س: الانعام، آيت: ۱۲۴)

ترجمہ ☆ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں رکھے۔

☆ معلوم ہوا ”جعل رسالت“ کے لئے ایک خاص نکل ہوتا ہے اور وہ نکل وہ ہے کہ جو جسمانی، روحانی، ظاہری، باطنی طور پر اعلیٰ، اکمل اور اعظم ہوتا ہے۔ میں مختصر طور پر عرض کروں گا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کمالات کا ظہور صدیقین میں ہوا، شہداء اور صلحاء میں ہوا۔ یہ نبوت کا آئینہ صدیقیت کا حسن اپنے اندر رکھتا ہے اور صدیقین کمال نبوت کا مظہر ہیں۔ اور مجھے کہنے دیجئے کہ جتنے صدیقین ہوئے اور امت مسلمہ میں صدیق اکبر جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان کا کمال صدیقیت یہ حضور ﷺ کے کمال نبوت کے حسن کا ظہور ہے اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، جن کو اللہ تعالیٰ نے صدیقیت کے علاوہ شہادت بھی عطا فرمائی، یہ بھی حسن نبوت کا ظہور ہے اور اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حسن صدیقیت کے ساتھ حسن شہادت سے بھی نوازا، وہ بھی جمال نبوت ہے اور مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اللہ تعالیٰ نے حسن صدیقیت کے ساتھ حسن شہادت بھی ان کو عطا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اہل بیت اطہار، صحابہ کرام اور ازواج مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ان تمام خوبیوں سے نوازا اور مجھے کہنے دیجئے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی جو شہادت ہے وہ شہادت محمدی کا ظہور ہے اس موضوع پر اور کچھ زیادہ تفصیل سے عرض نہیں کر سکتا۔ تا عرض کروں گا کہ دیکھیے، اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بھی شہید فرمایا، ”وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ“ (س بروج آیت ۹) اور رسول کے حق میں شہید کا لفظ ارشاد فرمایا، ”وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا“ اور اسی طرح مومنین کے حق میں فرمایا، ”لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلٰی النَّاسِ“ (س بقرہ آیت ۱۴۳)

☆ اللہ بھی شہید ہے، رسول بھی شہید ہیں تو اب شہید کا مفہوم کیا ہے؟ اگر یہ کہیں کہ فقط مقتول فی سبیل اللہ کو شہید کہا جائے یعنی جو اللہ کی راہ میں مقتول ہو جائے تو پھر نہ اللہ شہید ہو سکتا ہے، نہ رسول شہید ہو سکتا ہے اور نہ تمام مومنین شہید ہو سکتے ہیں۔ اصل میں شہید کے معنی ہیں

الشهادة والشهود، الحضور مع المشاهدة أما بالبصر أو بالبصيرة (١)

۶۴ یعنی شہادت اور شہود کے یہ معنی ہیں کہ حاضر ہونا اور فقط حاضر ہونا نہیں بلکہ مشاہدے کے ساتھ حاضر ہونا، دیکھتے ہوئے، سنتے ہوئے اور جانتے ہوئے حاضر ہونا، یہ ہے شہادت اور شہود میں تو مختصر طور پر عرض کرنا ہوں کہ اللہ کے شہید ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم و قدرت، اپنی حکمت اور کرم و بصر کے ساتھ تمام کائنات پر حاضر ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ اپنے علم و قدرت اور اپنی کرم و بصر کے ساتھ حاضر نہ ہو۔ اسی لئے ہم اللہ کے لئے حاضر ناظر کا لقب استعمال کر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ شہید ہے کہ وہ اپنی کائنات اور اپنے بندوں پر حاضر ہے اور مومنین شہید ہیں اس اعتبار سے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عظمت و پناہ میں محلِ عزت پر حاضر ہیں۔ اس لئے مومنین کو شہید کہا گیا اور مقتولین فی سبیل اللہ ان کے لئے تو خاص قسم کا محلِ عزت اور محلِ کرامت مقرر فرمایا ہے جو خدا کی بارگاہ میں ہے اور جب یہ لوگ خدا کی بارگاہ میں اس محلِ عزت اور محلِ کرامت پر پہنچیں گے جو ان مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے تیار کیا ہے تو یوں کہیے کہ اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور اس محلِ کرامت میں خدا کے سامنے موجود ہوں گے تو جس قدر بھی مومنین مقتول فی سبیل اللہ ہیں، ان کے شہید ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اپنے اپنے مرتبے اور اپنے اپنے منصب کے مطابق یہ محلِ کرامت اور محلِ عزت پر خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ تو یوں کہیے کہ بندے کا حاضر ہونا، بندے کا شہید ہونا یا بس معنی ہے کہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہے۔ خدا کا شہید ہونا یا بس معنی ہے کہ وہ اپنے بندوں پر حاضر ہے اس لئے شہید ہے اور بندے مومنین، مقتولین فی سبیل اللہ اپنے مناسب اور اپنے مرتب اور درجات کے اعتبار سے محلِ کرامت پانے کے لئے اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہیں لہذا



مومن شہید ہے کہ وہ رب کی بارگاہ میں حاضر ہے اور رب اس لئے شہید ہے کہ وہ اپنے بندوں پر حاضر ہے اور رسول بھی شہید ہیں۔ قرآن نے کہا، ”وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّسُلِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ“ (پ: ۲، آیت: ۱۳۳)

☆ رسول کے شہید ہونے کا مقصد کیا ہے؟ تو میں آپ کو بتا دوں کہ اس کے شہید ہونے کا مقصد یہ ہے کہ ہم تو خدا پر حاضر اور خدا ہم پر حاضر اور رسول ہم پر بھی حاضر اور خدا پر بھی حاضر، رسول بندوں پر بھی حاضر ہے کیونکہ اگر بندوں پر حاضر نہ ہو تو خدا کے ہاں وہ کوئی کیسے دے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

فَكَفَيْتَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا (پ: ۵، س: النساء: آیت: ۴۱)

☆ ہر نئی اپنی امت پر شہید ہوتا ہے اور کوہ ہوتا ہے اگر نئی اپنی امت اور اپنے غلاموں پر حاضر نہ ہو تو ان کی شہادت رب کی بارگاہ میں نہیں دے سکتا اور اگر وہ خدا پر حاضر نہ ہو تو اس کی شہادت بندوں کے سامنے دے نہیں سکتا۔ اس لئے نبی خدا پر بھی حاضر ہے اور بندوں پر بھی حاضر ہے۔ خدا کی بات بندوں کو پہنچاتا ہے اور بندوں کی بات خدا کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے اور اسی بنا پر اس کو شہید ہونے کا منصب حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت اسی مضمون کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ ”وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّسُلِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ“ اور ”فَكَفَيْتَ إِذَا جِئْنَا“ الخ

☆ بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام منصب نبوت پر جب فائز ہوتے ہیں تو انسانی تخلیق کے مقصد کی تکمیل کے لئے فائز ہوتے ہیں تو اس لئے اللہ تعالیٰ اس کام کو انجام دینے کے لئے انہیں کامل علم عطا فرماتا ہے اور ان کا کامل علم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (پ: ۱، س: البقرة: آیت: ۳۱)

☆ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا

وَكَذَلِكَ نُبَيِّنُ لِأَيُّهَا الَّذِينَ هُمْ مَلَائِكَةُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (انعام آیت: ۷۵)

☆ اور اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں فرمایا

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (پ: ۵، س: النساء: آیت: ۱۱۳)

☆ میں عرض کر رہا تھا کہ کامل علم جب تک نہ ہو، نبی منصب رسالت کے مطابق کام انجام نہیں دے سکتا اور نبی کے قوی اور نبی کا علم اگر کامل نہ ہو تو وہ ان تمام مناصب کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ نبی کو اللہ تعالیٰ اتنی روحانی قوت عطا فرماتا ہے کہ وہ اپنی امت اور اپنے غلاموں کے قلوب کا تزکیہ کرتا ہے اگر نبی کی روحانیت اکمل نہ ہو، نبی کی روحانیت قوی نہ ہو تو کیسے وہ ہمارا تزکیہ فرما سکتا ہے۔ قرآن نے کہا

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ (پ: ۴، س: آل عمران: آیت: ۱۶۴)

☆ تو اس آیت میں صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نبیوں کو اس لئے بھیجتا ہے اور اپنے حبیب ﷺ کو اس لئے بھیجتا ہے کہ ہمارے نفس کا تزکیہ کریں۔ ہمارے باطن کو پاک کریں۔ جب تک انکی روحانیت اتنی قوی نہ ہو کہ اسکا اثر ہمارے باطن تک پہنچے تو کس طرح ہم پاک ہو سکتے ہیں۔

خبر و شتر



نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

☆ اللہ رب العزت نے نظام کائنات کو ایک منج، ایک اصول، اور ایک حکمت پر قائم فرمایا۔ فطرت کے اصول اور قوانین قدرت،

اللہ رب العزت کی محکم و مضبوط حکمتیں تمام نظام کائنات کی بنیاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں فرمائی کہ جس کے اندر خیر

اور شر کے دونوں پہلو نہ ہوں۔ رب کائنات نے ایک قانون نظام کائنات کی بنیاد کے طور پر قرآن مجید میں اس نوعیت کے ساتھ بیان

فرمایا کہ اگر قرآن کو غور سے پڑھا جائے تو آفتاب سے زیادہ روشن ہو کر یہ حقیقت ہماری نگاہوں کے سامنے آ جائے گی کہ کائنات میں ایک چیز کا پہنچانا اس کی ضد کے



پہچاننے کے ساتھ متعلق فرمایا گیا ہے۔ جس کے لئے عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ:

أَلَا تَهْتَابُ أَنْ يُفَازَكَ بِذُنُوبِهِ

ترجمہ: یعنی چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔

☆ آپ جانتے ہیں کہ نور کی ضد ظلمت ہے اگر ظلمت کا وجود نہ ہو تو نور کی معرفت نہ ہو۔ موت کی ضد حیات ہے۔ اگر موت نہ ہو تو حیات کے معنی مفہوم نہ ہوں۔  
خبر کی ضد شر ہے۔ اگر شر نہ پائی جائے تو خبر کے معنی اور مفہوم لوگوں پر واضح نہ ہوں اسلام کی ضد کفر ہے اور ہدایت کی ضد ضلالت ہے۔

☆ خوب سمجھ لیجئے کہ ہدایت کا وجود ضلالت کی وجہ سے ظاہر ہوا۔ اسلام کی حقیقت کفر کی ظلمتوں کی وجہ سے بے نقاب ہو کر سامنے آئی۔ کفر کی ظلمتوں کے وجود کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس حقیقت کو بھی کوئی محض نہیں سکتا کہ کفر کی تاریکیوں سے اسلام کے نور کی ایسی وضاحت ہوئی کہ ابلا بابل انسان کا ذہن ان حقیقتوں سے بھر پور ہو گیا، جو حقیقتیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے دامن میں رکھی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ضلالت کے مفہوم نے ہدایت کے معنی کو، موت کے معنی کو حیات کے معنی کو اور شر کے تصور نے خبر کے تصور کو اجاگر کر دیا۔ ثابت ہوا کہ چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ یاد رکھیے کہ یہ ایک اصول ایسا ہے کہ جس کو قرآن مجید نے متعدد مقامات پر بیان فرمایا اور اگر آپ انسان کی عیدائش کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ اصول آپ کو بالکل واضح طور پر سمجھ میں آ جائے گا۔

☆ سب سے پہلے انسان سیدنا آدم علیہ السلام نے اس مشہدات میں، اس عالم اجسام میں، اس عالم ناسوت میں اپنا خلیفہ بنا کر ہدایت کا جھنڈا لہرانے کے لئے بھیجا، لیکن ہدایت کا صبح، وجود آدم ابھی دنیا میں جلوہ گر بھی نہ ہوا تھا کہ ان کے مقابلے میں ضلالت کا تصور قائم ہو چکا تھا اور اس کو ہم شیطان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ”كَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ“ یعنی علم الہی میں تو وہ پہلے ہی سے کافر تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہدایت کے ساتھ ضلالت کا تصور بھی موجود تھا۔ شیطان جو کہ مرکز ضلالت اور مرکز کفر ہے اس کی ضلالتوں کے ظہور سے ہمیں یہ سبق ملا کہ شیطان کفر اور ضلالت کی راہوں پر چل کر راندہ درگاہ ہوا۔ ذلیل ہوا، مرود ہوا، ہلکا ہوا۔

☆ اب اگر کوئی خدا کا مقبول بنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان راہوں سے بچے جن راہوں پر چل کر شیطان راندہ درگاہ ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ شیطان کی ضلالت کے تھوڑے ہی ہدایت کو کس قدر نمایاں کر دیا کہ جن راہوں پر شیطان چلا، وہ ایسی راہیں تھیں کہ جن پر چلنے والا خدا کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔ اب اگر ان راہوں سے کسی کو بچنا ہے تو ضروری ہے کہ یہ راہیں اس کے سامنے ہوں۔ تاکہ اس کے ذہن میں خبر کی راہوں کا تھوڑا سا چمک ہو سکے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہدایت کی راہوں کو واضح کرنے کے لئے ضلالت کی راہوں کو پہلے دکھادیا اور قرآن مجید میں فرمایا، ”وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ“ ہم نے دونوں راہیں (انسانوں کے سامنے) رکھ دیں کہ یہ خبر ہے، وہ شر ہے، یہ ہدایت ہے، وہ گمراہی ہے۔ یہ اسلام ہے، وہ کفر ہے۔ شر اور خبر کا کاٹل کر کے بتادیا ہے کہ جب تک تیرے سامنے شر کا تھوڑا نہیں آئے گا، اس وقت تک تو خبر کی راہوں کو اختیار نہیں کرے گا اور شر سے بچ نہیں سکے گا۔ شر سے بچنے کے لئے اس کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اللہ ضرورت سے پاک ہے۔ ہمیں ضرورت ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ شر کیا ہے؟ برائی کیا ہے؟ مصیبت کیا ہے؟ کفر کیا ہے؟ کس بات سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ جب تک یہ حقیقت کھل کر ہمارے سامنے نہ آئے ہم خدا کے غضب سے بچ نہیں سکتے بلکہ اس بات کا یقین ہے کہ اللہ خدا کے غضب کو دعوت دیدیں۔

☆ یہ پہلا مقدمہ تھا جس کو میں نے قرآن پاک کی روشنی میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا۔ اب دوسرے مقدمے کو لے لیجئے اور وہ یہ ہے کہ جب خدا نے ہر چیز میں خبر اور شر دونوں پہلوؤں کو رکھا ہے تو آپ کہیں گے کہ کفر و ضلالت میں کون سا خبر کا پہلو ہے۔ میں ابھی ابھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس میں خبر کا پہلو یہ ہے کہ اگر کفر و ضلالت کی راہیں ہمارے سامنے نہ ہوں تو ہم ان سے بچ نہیں سکتے۔ ان سے بچنا یہ خبر ہے۔ لہذا اس میں بھی خبر کا پہلو موجود ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ نمایاں طور پر آپ اس حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو قرآن کی صریح نص موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کے متعلق فرمایا کہ ”الْأَنفُثُ مَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا“ یعنی یہ جو اور یہ شراب ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان میں خبر اور نفع کا پہلو پایا جاتا ہے۔ لیکن خبر نفع کا پہلو بہت ہی مغلوب ہے اور شر اور ضرر کا پہلو بہت قوی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے نجاست، گندگی، اور شیطانی عمل قرار دیا اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے نفع کا ذکر فرمایا تو پتہ چلا کہ ہر چیز کے اندر خبر و شر کے پہلو پائے جاتے ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ کسی میں خبر کو غالب کر دیا گیا اور کسی میں شر کو غالب کر دیا گیا اور جہاں شر غالب ہو اس سے ہمیں بچنا ہے اور جہاں خبر



غالب ہو، اس کو اختیار کرنا ہے۔ اب اگر آپ دوسرے انداز سے سوچیں تو ایک اور اعتراض آپ کے ذہن میں پیدا ہوگا۔ مثلاً آپ کہیں گے کہ ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ کفر کے اندر بھی خیر کا پہلو ہے، کو بے حد قلیل ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اسلام میں بھی کوئی شر کا پہلو ہوگا؟ نیز ہدایت میں بھی کوئی نہ کوئی شر کا پہلو ہونا لازمی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شر عام ہے اس سے کہ وہ شر اخروی ہو یا دنیوی یا جسمانی ہو یا روحانی ہو۔ ظاہری ہو یا باطنی، قلیل ہو یا کثیر، محسوس ہو یا معقول ہو، یعنی احساس کے ادراک سے تعلق ہو یا عقل کے ادراک سے تعلق ہو۔ اب مجھے بتائیے کہ جو لوگ ایمان کو دیانت کو تقویٰ کو، پرہیزگاری کو اختیار کرتے ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار ارشاد فرمایا کہ تمہیں نیکی کے کاموں میں تکلیف تو ضرور ہوگی، مگر یہ سمجھ لو کہ یہ تکلیف محض عارضی ہے۔ قلیل ہے اور اس تکلیف کو محسوس مت کرنا بلکہ اس راحت پر نظر رکھنا جو اب دی اور دائمی ہے آپ بتائیے کہ ہم روزہ رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں۔ یہ سب قلیل ہے۔ زکوٰۃ دینے میں آدمی اپنی جیب سے پیسے دیتا ہے۔ پیسہ دینا بھی بظاہر سب قلیل ہے۔ ہم جو نماز پڑھتے ہیں اس میں کچھ وقت لگاتے ہیں رکوع اور سجدے کرتے ہیں گرمی کے زمانے میں گھر سے چل کر مسجد میں جاتے ہیں۔ گرمی کی تکلیف برداشت کرتے ہیں سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے ہیں جماعتوں میں شرکت کی زحمت کو ادا کرتے ہیں۔ یہ سب زحمات ہیں اور یہ سب تکلیف قلیل اور عارضی ہیں علیٰ ہذا القیاس۔ جن لوگوں نے کلمہ حق بلند کیا، آپ جانتے ہیں کہ وہ کتنے مصائب و آلام میں مبتلا ہوئے خود اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

وَذُرُوا نُوحًا فَقَوْلِ الرَّسُولِ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ

☆ یعنی ان پر اتنے مصائب و آلام آئے کہ وہ ہلا دیئے گئے یہاں تک کہ رسول اور ایمان والوں کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ کب اللہ کی مدد آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

إِنَّا نَصْرُ اللَّهُ قَرِيبٌ

ترجمہ ☆ خبردار ہو جاؤ کہ اللہ کی مدد بہت قریب ہے۔

☆ یہ جو تم پر تکلیف آئی تم ہلا دیئے گئے ہو، یہ جو اذیت کا ایک پہلو ظاہری ہو یا یہ سب قلیل ہے اس سے مت گھبرانا بلکہ خیر کثیر پر نظر رکھنا اور دیکھنا کہ اس کے عواقب و نتائج کتنے زریں و بہترین ہیں۔

☆ دیکھئے شہیدوں کا کتنا درجہ مرتبہ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ ﷻ شہداء کے لئے نور کے منبر بچھائے گا۔ انہیں نور کے منبروں پر بٹھایا جائے گا اور شہیدوں سے کہا جائے گا کہ تم جس کو چاہتے ہو شفاعت کرو۔

☆ ان کی شفاعت، حضور اکرم ﷺ کی شفاعت کبریٰ کا ایک پہلو اور صدقہ ہوگا اس لئے کہ اصل شفاعت کبریٰ کے مالک تو حضور ہیں۔ اب بتائیے کہ یہ کتنا اعزاز و اکرام اور مرتبہ ہے جو اللہ تعالیٰ شہداء کو عطا کرے گا اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ شہیدوں کے لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف ارشاد فرمایا

وَلَا تَقُولُوا لِمَن قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَمْوَاتٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ

ترجمہ ☆ شہداء کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں شعور نہیں

☆ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی حیات کے ساتھ شرف فرمایا اور ان کو بڑی عزت اور بڑی کرامت عطا فرمائی لیکن آپ جانتے ہیں کہ شہادت کا درجہ پانا آسان کام نہیں ہے جو لوگ میدان کارزار میں شہادت کا درجہ پاتے ہیں ان کو میدان میں کس قدر تلخیں ہوتی ہیں کس قدر وہ زخم خوردہ ہوتے ہیں اور کس قدر ان پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں، اب یہ تکلیف کیا ہے؟ یہ سب قلیل ہے۔ یہاں بات ہے کہ جس کے دل میں خدا اور اس کے رسول کی محبت غالب ہو وہ ان تلخیوں کے مقابلے میں کروڑوں راحتوں کو ٹھوکر مار دے گا اور کہے گا کہ مجھے کوئی راحت درکار نہیں ہے بلکہ ہر راحت سے بڑھ کر مجھے وہ زحمت عزیز ہے جو خدا اور اس کے رسول کی رضا کی راہ میں حاصل ہو رہی ہو۔ شہید کے اسی جذبہ صادق کا نتیجہ ہے کہ حضورنا جدا رہد فی ﷻ نے فرمایا کہ شہید قتل کا درد اور تکلیف محسوس نہیں کرتا لیکن ایسے جیسے کہ تم میں سے کسی شخص کو چیونٹی کے کاٹنے یا کسی کی چٹکی بھر لینے کی تکلیف محسوس ہوتی ہو۔

☆ ظاہر ہے کہ یہ کوئی خاص تکلیف نہیں لیکن بظاہر یہ بات مشاہدات کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی قتل ہوگا اس

کی ہڈیاں ٹوٹیں گی، اسکے سینے میں نیزے داخل کئے جائیں گے۔ خون کے فوارے جاری ہوں گے تو تکلیف تو لازماً ہوگی لیکن حضور



نے فرمایا کہ شہید کو انتہائی معمولی تکلیف ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ الشہید میں الف لام عہد کا ہے اور شہید سے وہ شہید مراد ہے جس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ غالب ہو چکی ہو کہ اس کا دل یہ چاہتا ہو کہ ایک جان نہیں کروڑوں جانیں ہوں تو میں اپنے محبوب کی عظمت پر قربان کروں۔

کروں	تیرے	نام	چہ	جان	فدا
نہ	بس	ایک	جاں	جہاں	فدا
دو	جہاں	سے	بھی	نہیں	جی بھرا
کروں	کیا	کروڑوں	جہاں	نہیں	

☆ اگر کسی شخص کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ کی پیدا ہو گئی ہے تو یہ محبت تکلیف اور احساس کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اور تکلیف محسوس نہیں ہونے دیتی۔ یہ محبت ایک حجاب ہے، تکلیف اور محسوس کرنے والے کے درمیان اگر کسی شخص کا آپریشن کرنا چاہتا ہے تو مریض کے نشہ سو گھانے کے بعد مریض کی ہڈیاں کاٹتے رہو، گوشت چیرتے رہو، رگیں کاٹتے رہو، ٹانگے لگاتے رہو اس کو بالکل یہ نہیں چلتا لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہڈیاں کاٹنے کی تکلیف نہیں ہوتی۔ آپ کہیں گے کہ تکلیف تو ہوتی ہے لیکن نشہ تکلیف اور احساس کے درمیان حجاب بن جاتا ہے، اگر وہ نشہ اتر جائے تو پھر اس مریض سے پوچھو کہ تیرا کیا حال ہے؟ اسی طرح شہید کو بھی تکلیف کا درد اس لئے محسوس نہیں ہوتا کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس کے دل میں اس درجہ غالب ہو جاتی ہے کہ وہ تکلیف اور احساس کے درمیان حجاب بن جاتی ہے اور بھی جس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت غالب ہو جائے اس کی تو بہت بڑی شان ہے وہ تو بڑی عظمت والا انسان بن جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی محبت مصر کی جن عورتوں کے دلوں میں پیدا ہو چکی تھی، ان کا یہ حال تھا کہ جب زلیخانے کہا کہ ذرا اس چھری سے پھل تراش تو میں نہیں کہتا قرآن نے کہا کہ ”وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ“ مطلب یہ کہ انہوں نے پھل نہیں کاٹا، ہاتھوں کو کاٹ لیا۔ مگر ہاتھوں کو کاٹنے کے باوجود یہ نہیں کہا کہ ہائے، ہم نے ہاتھ کاٹ لئے بلکہ یہ کہا کہ

خَاسَهَا لِلّٰهِ مَا هَذَا بَشَرًا اِنْ هَذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ

ترجمہ ☆ یعنی خدا کی قسم! یہ تو بشر ہے ہی نہیں، یہ تو کوئی ملک کریم (فرشتہ) ہے

☆ دیکھا آپ نے، انہوں نے کوئی بات ہاتھ کاٹنے کی نہیں کی..... کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت کا غلبہ ان کے دل و دماغ پر ایسا تھا کہ تکلیف اور اس کے احساس کے درمیان حائل ہو گیا۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت کا غلبہ ہاتھ کاٹنے کی تکلیف محسوس نہیں ہونے دیتا تو جہاں حضور کی محبت کا غلبہ ہو وہاں سر کاٹنے کی تکلیف کیسے محسوس ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا کہ قیامت کے دن وہ مخصوص شہداء جن کا میں ذکر کر رہا ہوں، جب ان کو تمام جنتیوں کے ہمراہ بلایا جائے گا اور کہا جائے گا تم دنیا میں جانا چاہتے ہو تو تمام جنتی انکار کر دیں گے کہ کون کی راحت ہے جو جنت میں ہمیں میسر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں جا کر مصیبت میں مبتلا ہوں، سب جنتی انکار کر دیں گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ پیش کش ہوگی کہ تم جنتی دنیا چاہتے ہو اس سے بہت زیادہ عطا کر کے ہم تم کو بھیجیں گے لیکن حدیث میں آیا کہ لا شہید۔ سوائے شہید کہ جو کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا کہ مجھے دنیا میں پھر بھیج دو! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے میرے شہید! سب جنتیوں نے دنیا میں واپس جانے سے انکار کر دیا، تجھے یہاں کون سی تکلیف ہے اور یہاں کون سی راحت فہیب نہیں ہے کہ تو دنیا میں جانا چاہتا ہے تو شہید دست بستہ عرض کرے گا کہ مولیٰ ہر نعمت تیری جنت میں موجود ہے اور تیری جنت میں کوئی کمی نہیں ہے لیکن تیرے نام پر تیری محبت میں سرکٹانے کا جو مزہ وہاں آیا تھا وہ یہاں نہیں آ رہا۔ جب وہ مزایا داتا ہے تو یہ سب نعمتیں سچ معلوم ہوتی ہیں۔ جنتیوں کو یہ نعمتیں مبارک رہیں ہمیں تو دنیا میں پھر بھیج دے تا کہ تیرے نام پر پھر سرکٹائیں اور پھر وہ حلاوت پائیں اور پھر دنیا میں جائیں اور پھر تیرے نام پر سرکٹائیں اور پھر وہ حلاوت پائیں اور پھر دنیا میں جائیں اور پھر تیرے نام پر سرکٹائیں۔ ہمیشہ کے لئے سرکٹانے کے کام پر مقرر کر دے۔

☆ اللہ عزوجل! میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ مقام ان مخصوص شہداء کا ہے جن میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس قدر غالب ہو

جائے کہ وہ تکلیف اور احساس کے درمیان حجاب بن جائے لیکن اگر یہ عارضی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ گردن کاٹنے کی، ہڈیوں کے کاٹنے کی

تکلیف ہوتی، یہ تکلیف شریقل ہے۔

☆ شہادت ایک بہت بڑی نعمت ہے، مگر اس کے اندر بھی شریقل کا پہلو پایا جاتا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ ہر چیز میں خیر اور شر دونوں پہلو رکھ دیئے گئے ہیں مگر فرق اتنا



ہے کہ کسی میں شر غالب ہے اور کسی میں خیر غالب ہے۔ جہاں خیر غالب ہے اس کے کرنے کا اور جہاں شر غالب ہے اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

☆ عزیزانِ گرامی! آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی لذتیں، دنیا کی خواہشات جب انسان پوری کرتا ہے تو اس کو کتنا مزہ آتا ہے لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ جو لوگ دنیا کی لذتوں اور خواہشات میں مستغرق ہو گئے، ان کا کیا حال ہوا ہے؟ وہ ہلاک ہو گئے۔ اب یہ دنیا کی خواہشات میں استغراق، یہ خیر قلیل ہے لیکن اس کے نتیجہ میں ہلاک ہوتا، یہ شر کثیر ہے۔

☆ ان تمام جزئیات کو پیش نظر رکھ کر یہ اصول قرآن کریم کی روشنی میں ہم کو بالکل حق نظر آتا ہے کہ ہر چیز میں خیر اور شر دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے طفیل ہمیں ان چیزوں کو اختیار کرنے کی توفیق عطا کرے جن میں خیر کثیر ہو۔ آمین!

## امام اعظم بحیثیت محدث اعظم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
نَذِّنْکُمْ بِمَا کُنْتُمْ عَلٰی دَعْوٰی الْکُفْرِیْنَ

☆ محترم حضرات! میں اتنی بار خانوال آیا لیکن آپ بتائیے کہ میں نے آج تک شوکانی (۱) کے بارے میں کچھ کہا؟ کبھی میں نے نواب صدیق حسن بھوپالی (۲) کے متعلق کچھ ذکر کیا؟ یا کبھی میں نے کسی اہل حدیث عالم کا نام اپنی گفتگو میں لیا؟ لیکن آج مجھے نہایت دکھ ہوا اور میرا دل بہت زخمی ہوا، جب میں نے سنا کہ خانوال کی سرزمین پر امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ پر طعن کیا گیا، ان کی توہین کی گئی اور ان کے حق میں نازیبا کلمات کہے گئے۔ مجھے یہ سب کچھ جان کر نہایت دکھ پہنچا اور میرا دل بہت زخمی ہوا۔ لیکن اس سب کے باوجود بھی میں صبر کروں گا اور صبر کا مطلب یہ ہے کہ میں گالی کا جواب گالی سے نہیں دوں گا اور میں دریدہ ذہنی کا جواب دریدہ ذہنی سے نہیں دوں گا بلکہ میں برائی کو اچھائی سے رفع کروں گا۔

☆ محترم حضرات! میں نے آپ کے سامنے قرآن پاک کی ایک آیت کریمہ کا کچھ حصہ تلاوت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَخْلَفُونَ وَالدِّينَ لَا يَخْلَفُونَ (ب ۲۳۔ س الزمر۔ آیت ۹)

☆ یعنی اے میرے محبوب ﷺ آپ ارشاد فرمادیں کہ کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو کہ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے؟ کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ علم والوں کی شان تو یہ ہے کہ

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (ب ۲۲۔ س فاطر۔ آیت ۲۸)

☆ ”اللہ کے بندوں میں اللہ سے وحی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔“

☆ یعنی اللہ کا خوف اور اللہ کی خشیت دل میں رکھنے والے اگر ہیں تو فقط علماء ہیں اور یا در کھئے وہ کیسے علماء ہیں؟ ہم جیسے نہیں۔ استغفر اللہ! چہ نسبت خاک ربا عالم پاک۔ ہم جیسے لوگوں نے تو آج علم کا نام بدنام کر دیا۔

☆ میرے دوستو اور عزیزو! یہاں علماء سے مراد ایسے علماء ہیں جیسے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے، سیدنا فاروق اعظم، سیدنا عثمان غنی ذوالنورین، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ، سیدنا حسن بصری (۱)، سعید بن منیب (۲)، سعید بن جبیر (۳) رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے اور مجھے کہنے دیجئے کہ علماء سے مراد ہم جیسے لوگ نہیں بلکہ علماء سے مراد وہ مقدسین اور طہیبین و طاہرین ہیں جنہوں نے علم کے چشمے جاری کر دیئے۔ ان میں سیدنا عبداللہ بن مسعود ہیں، عبداللہ بن عمر ہیں (۴)، عبداللہ بن عباس (۵) ہیں اور ان کے شاگرد سعید بن جبیر ہیں۔ علقمہ بن قیس اور ان کے شاگرد حضرت ابراہیم نخعی ہیں اور ابراہیم نخعی کے شاگرد سیدنا حماد ہیں اور حضرت حماد کے شاگرد امام ابو حنیفہ ہیں رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

☆ اے عبداللہ بن مسعود! کروڑوں سلام ہوں آپ پر، آپ نے جو علم حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ کو دیا، اس کا تصور بھی ہمارے ذہن



سینہ مبارک سے جو علم حضرت ابن مسعودؓ نے حاصل کیا، اس علم سے آپ نے حضرت علقمہ (ع) کا سینہ روشن کر دیا۔ اور اے علقمہ! آپ پر کروڑوں سلام ہوں کہ آپ نے اس علم سے ابراہیم غشی (۸) کے سینے کو منور کر دیا۔ اور اے ابراہیم غشی! کروڑوں سلام ہوں آپ پر کہ آپ نے حضرت حماد (۹) کے سینے کو علم کا خزینہ بنادیا اور اے حماد کروڑوں سلام ہوں آپ پر کہ آپ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کو اپنی مسند علم پر بٹھادیا۔

☆ میرے دوستو! یہ ہیں وہ اہل علم، جن کے لئے قرآن نے کہا

إِنَّمَا يُخَشَى اللّٰهُ مِنَ الْعُلَمَاءِ (ب ۲۲۔ س فاطر۔ آیت ۲۸)

☆ اس امام ابو حنیفہؒ کو ضعیف السند کہنے والو! میں تمہیں بتادیتا چاہتا ہوں کہ آج تمہیں کتنا ہی فخر کیوں نہ ہو اپنی محدثیت پر لیکن تم امام ابو حنیفہؒ کے دربانوں کی گروہ کو بھی نہیں پاسکتے کیونکہ ابو حنیفہؒ تو ایسے قوی السند تھے کہ دنیا تو سند حدیث میں ضبط کتاب پر اعتماد کرتی ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب تک ضبط حافظہ سے کوئی حدیث روایت نہ کرے ہم اعتبار نہ کریں گے۔

☆ ارے تم نے انہیں اہل الرائے کہہ کر ان پر طعن کیا، مگر میں تو رائے کو برا نہیں سمجھتا۔ میں تو اس رائے کو برا سمجھتا ہوں جو اللہ کے فرمان کی مقابل ہو۔ ایسی رائے یقیناً مذموم ہے۔ کیونکہ وہ سیدھا دوزخ کا راستہ ہے۔ لیکن میں تمہیں بتادیتا چاہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہؒ کی وہ رائے نہ تھی بلکہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے وہ تھی جو جنت کا راستہ دکھاتی تھی حید کی راہیں روشن کرتی اور بارگاہ رسالت کی طرف رہنمائی کرتی تھی۔ جو امام ابو حنیفہؒ پر اس لئے طعن کرتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنی رائے سے کیوں کہا تو میں اسے کہتا ہوں کہ (۱) مجتہد کو اپنی رائے سے کہنے کا حق ہے۔ اگر امام ابو حنیفہؒ کے اجتہاد کی بنا پر تم انہیں اہل الرائے کہتے ہو اور اس اجتہاد پر انہیں مطعون کرتے ہو تو پھر تمہارا یہ طعن تو نعوذ باللہ بارگاہ رسالت تک پہنچے گا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ نے بھی اجتہاد فرمایا تھا۔ حالانکہ حضور ﷺ کو اجتہاد کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ آپ تو وہ مقدس ہستی ہیں، جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی وحی آتی تھی بات یہ ہے کہ بارگاہ نبوت کی آواؤں کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر حضور ﷺ اجتہاد نہ فرماتے تو اجتہاد کے جواز کے لئے دلیل کہاں سے آتی؟ معلوم ہوا مجتہدین کے اجتہاد کے لئے دلیل فراہم کرنے کے لئے سرکارِ دو عالم ﷺ نے نہ صرف خود اجتہاد فرمایا بلکہ صحابہ کرام کو بھی اجتہاد کے مواقع فراہم کیے۔

☆ بخاری شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کو بنو قریظہ کی جانب بھیجا اور ارشاد فرمایا لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظہ یعنی ”تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ جا کر۔“ اور مسلم شریف میں یہ حدیث یوں ہے کہ ”تم میں سے کوئی ظہر کی نماز، بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے۔“

☆ اب دیکھیے کہ ظہر عصر کی مغائر ہے کہ نہیں ہے؟ اگر کوئی عصر کی نیت کر کے ظہر کی نماز پڑھے تو کیا اسکی نماز ہوگی؟ ہرگز نہیں ہوگی کیونکہ عصر اور ہے اور ظہر اور ہے۔ اب بنو قریظہ کی جانب جس جماعت کو حضور ﷺ نے بھیجا اس کیلئے حضور ﷺ کے الفاظ بخاری میں ہیں کہ تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ جا کر اور مسلم میں ہیں کہ تم میں سے کوئی ظہر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے۔ معلوم ہوا کہ دونوں حدیثوں میں تقارن ہے اور حدیثوں میں یہ اختلاف ایک حقیقت ثابت ہے۔

☆ اب امام ابو حنیفہؒ پر الزام لگانے والوں میں سے میں پوچھتا ہوں کہ بتاؤ جو جماعت حضور ﷺ نے بنو قریظہ کی جانب بھیجی، اس جماعت کو آپ نے ظہر کی نماز کے بارے میں فرمایا عصر کی نماز کے متعلق؟ بتاؤ ان مختلف احادیث میں تطبیق کیسے کرو گے؟ کیا رائے کے بغیر کام چلے گا؟ ہرگز نہیں، رائے کے بغیر یقیناً کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ تم رائے کے بغیر دونوں حدیثوں میں تطبیق نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ محدثین کے حوالے سے یہ کہو گے کہ دونوں حدیثیں تعدد واقعہ پر محمول ہیں یعنی ایک جماعت کو حضور ﷺ نے ظہر سے پہلے بھیجا اور فرمایا تم میں سے کوئی بھی ظہر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے اور دوسری جماعت کو حضور ﷺ نے عصر سے پہلے روانہ کیا اور فرمایا تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ تعدد واقعہ پر کوئی دلیل لاؤ اور کوئی ایسی حدیث بھی پیش کرو، جس سے ثابت ہو کہ حضور ﷺ نے ایک جماعت کو ظہر سے پہلے بھیجا اور دوسری جماعت کو ظہر کے بعد بھیجا ہو لیکن دس ہزار مرتبہ بھی تم مرکز زندہ ہو جاؤ تو تعدد واقعہ پر تم حدیث نہیں لا سکتے۔ معلوم ہوا کہ محدثین نے یہ تو جیہ اپنی رائے سے کی ہے اور رائے کو ہم مانتے ہیں، تم نہیں مانتے۔ اگر تم پاؤں چھپاتے ہو تو سر کھٹا ہے اور سر چھپاتے ہو



توپاؤں کھلتے ہیں۔

☆ اب ہوا یہ کہ جب حضور ﷺ نے اس جماعت کو بھیجا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنقرضہ پہنچے بغیر نہ پڑھے، لیکن بنقرضہ پہنچنے سے پہلے ہی وقت آتا تو ہوا یہ کہ اگر بنقرضہ پہنچے ہیں تو عصر کی نماز قضا ہو جاتی ہے۔ اب مسئلہ پیدا ہو گیا کہ حضور ﷺ کا تو حکم یہ ہے کہ ”لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظہ“ یعنی تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنقرضہ پہنچے بغیر نہ پڑھے، لیکن اس صورت میں تو نماز قضا ہو جاتی ہے اور اگر نماز پہلے ادا کرتے ہیں تو حضور ﷺ کی حکم عدولی ہوتی ہے۔ اب اس اختلاف کی صورت میں بعض صحابہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْفُوتًا (ب ۵ - س النساء - آیت ۱۰۳)

ترجمہ ☆ ”بے شک نماز ایمان والوں پر وقت مقرر کیا ہو اور فیض ہے۔“

☆ نماز فرض موقت ہے لہذا وقت سے مفر نہیں کیا جائے گا اور ہم ابھی نماز عصر ادا کریں گے تا کہ نماز وقت پورا ادا ہو جائے اور حضور ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ تھا کہ تم اتنی جلدی چلنا کہ نماز عصر بنقرضہ جا کر ادا کرو۔ اب اتنی جلدی نہیں چلو تو یہ ہماری غلطی ہے چنانچہ ہم نماز ادا کر لیتے ہیں۔ اس لئے ایک جماعت نے بنقرضہ پہنچنے سے پہلے عصر ادا کی، مگر کچھ صحابہ نے کہا کہ قضا اور ادا تو ہم جانتے نہیں، ہم تو حضور ﷺ کے فرمان پر عمل کریں گے کہ نماز عصر بنقرضہ پہنچے بغیر نہیں پڑھیں گے۔ اب صحابہ کی دونوں جماعتوں میں اختلاف ہو گیا کیونکہ دونوں نے اپنے اجتہاد سے کام لیا اور جب یہ دونوں جماعتیں یعنی اپنی رائے سے کام لینے والی حضور اکرم ﷺ کے سامنے پہنچیں تو حدیث میں آتا ہے کہ ”فلم یحلف واحدنا منهم“ یعنی حضور ﷺ نے کسی جماعت سے اظہارِ رائے کی منگی نہیں فرمایا۔

☆ مجھ سے دو حدیث میں کسی طالب علم نے سوال کیا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے اظہارِ رائے کی منگی کسی جماعت کے لئے نہیں فرمایا لیکن یہ بتائیے کہ آپ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ فلاں جماعت ثواب پر تھی اور فلاں خطا پر۔ میں نے عرض کیا، حضور ﷺ کو معلوم تھا کہ میری امت میں قیامت تک اجتہاد کا سلسلہ جاری رہے گا اور لوگ قیامت تک مجتہدین کے اجتہاد پر عمل کرتے رہیں گے اور ان کے اس اجتہاد کی خطا ظاہر نہیں ہوگی۔ اس لئے آپ نے پردہ پوشی فرمائی تا کہ دونوں جماعتوں کو ان کا ثواب ملتا رہے۔ اب اللہ بھی اجتہاد کرنے پر ان سے ناراض نہیں اور نہ رسول ان سے ناراض ہیں۔ اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو پھر ہوا کرے۔

☆ حدیث پڑھنے والوں سے پوچھو، سند حدیث اور خصوصاً حدیث کے بارے میں امام بخاری اور امام مسلم کی آراء میں اختلاف ہے۔ امام مسلم کہتے ہیں کہ راوی اور مروی عنہ کا محاصرہ ہونا کافی ہے، ہم اس کی حدیث کو قبول کر لیں گے، خواہ راوی کا مروی عنہ سے لقاء (ملاقات) ثابت ہو یا نہ ہو۔ اور امام بخاری کہتے ہیں کہ اگر راوی، مروی عنہ کا ہم عصر ہے تو ہم ہرگز اس کی حدیث کو قبول نہیں کریں گے اور اس کے اقطاع پر محمول کریں گے جب تک کہ راوی کی مروی عنہ سے ملاقات ثابت نہ ہو۔ اب بتاؤ کہ امام مسلم کی رائے اور ہے اور امام بخاری کی رائے اور؟ لیکن حدیث نہ ان کے پاس ہے، نہ ان کے پاس۔ تو یہ دونوں اصحاب رائے ہوئے کہ نہیں؟

☆ اسی طرح اصول حدیث کے علماء سے پوچھو کیا حدیث مجرد (ایسی حدیث جس کے سلسلہ روایت کو ذکر نہ کیا گیا ہو) کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے؟ حدیث مجرد ضعیف ہے کہ نہیں؟ اور میں خدا کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ بخاری میں کتنی حدیثیں مجرد ہیں، لیکن چونکہ امام بخاری کی رائے یہ ہے کہ یہ صحیح ہیں اس لئے تم نے ان کی صحت پر صاف (سکوت) کر دیا۔ امام بخاری کی رائے تمہارے نزدیک صحیح ہے لیکن امام ابو حنیفہ کی رائے تمہارے نزدیک قائل قبول نہیں۔ یہ ہے سوچ کا مقام!

☆ پھر میں کہتا ہوں کہ ابی اٹخ سے زہیر کی روایت کو امام بخاری نے صحیح مان کر اپنی جامع میں شامل فرمایا اور امام ترمذی نے اسے قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ زہیر کا ابی اٹخ سے سماع بوجہ علت غائیہ آخری عمر میں ہے۔ اس کے برعکس ابی اٹخ سے اسرائیل کی روایت کو قبول فرماتے ہیں۔ دونوں کی رائے مختلف ہو گئیں۔ میں حیران ہوں کہ امام ابو حنیفہ کی وہ حدیثیں جو متفق الاسانید ہیں، اگر تمہارے سامنے پیش کی جائیں تو تم اس پر ضعف کا الزام لگا کر رد کر دیتے ہو اور اگر امام ترمذی منقطع اور مرسل سے استدلال کریں تو تم خاموش بیٹھ رہتے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

☆ من لو! میں بتا دیتا چاہتا ہوں کہ امام بخاری کی بہت سی آراء امام مسلم کے خلاف ہیں اور امام مسلم کی بہت سی آراء امام بخاری کے خلاف ہیں۔ مقدمہ ابن الصلاح اٹھا کر دیکھو، وہاں ان کی عبارت میں کتنی شدت پائی جاتی ہے امام بخاری کے متعلق۔ لیکن میں امام بخاری اور امام مسلم دونوں کا احترام کرتا ہوں کیونکہ وہ امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں اور ان کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ امام بخاری! رحمۃ



اللہ علیہ آپ کی عظمتوں کے سامنے ہماری گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ اور اے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ آپ کی بارگاہ میں بھی ہماری عقیدتیں سرنگوں ہیں۔ لیکن میں متاثر و سرکھوں گا کہ تمام محدثین سرنگوں ہیں بارگاہ امام ابو حنیفہ میں (رضی اللہ عنہ) کیونکہ امام بخاری اور امام مسلم کو اگر تم مجتہد بھی قرار دو گے تو سوائے علم حدیث کے ان کا اجتہاد کسی اور مقام پر نہیں پہنچے گا۔ اور اے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ! آپ پر کروڑوں رحمتیں ہوں کہ آپ نے اجتہاد فرما کر ہدایت کی راہوں کو روشن کر دیا، کیونکہ آپ تو تفسیر میں بھی مجتہد ہیں، آپ تو کلام میں مجتہد ہیں، آپ تمام علوم دینیہ میں مجتہد ہیں، علی الاطلاق مجتہد ہیں۔ اب بتاؤ جو ایک علم میں مجتہد ہو، اس کی رائے کو تو مجتہد کی رائے کہہ کر تسلیم کرتے ہو اور جو مجتہد مطلق ہو، اس کے اجتہاد کو غلط کہہ کر طعن کرتے ہو۔

ناظرہ      سرگرمیاں      ہے،      اے      کیا      کیے

☆ اے امام ابو حنیفہ پر طعن کرنے والو! میں تم سے اگر خدا کے واحد ہونے کا معنی پوچھ لوں تو تم نہیں بتا سکتے۔ تم کیا جانو، تو جیسا کہ ہے؟ دیکھئے، قرآن نے کہا، "الْهَيْكُلُ الْوَاحِدُ" (سورہ نحل آیت ۲۲)۔ یعنی تمہارا خدا تو خدا ہے۔ اب آپ بتائیے، اللہ کو واحد ماننے ہو یا نگل ماننے؟ اور واحد کے معنی ہیں ایک، لیکن ایک بھی تو لفظ ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟ چنانچہ لفظ واحد پر علماء نے بحث کی اور انہوں نے کہا کہ واحد کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں ایک ہے "واحد عددی"، ایک ہے "واحد ضمی" اور ایک ہے "واحد نوعی"۔

۱۔ واحد عددی کا معنی ہے الواحد نصف الاثنین یعنی دو کا آدھا ایک ہوتا ہے (ہاتھ کے اشارے سے فرمایا) یہ دو ہیں، ان دو کا آدھا ایک ہے۔ اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ "الْهَيْكُلُ الْوَاحِدُ" کے کیا معنی کرو گے؟ دو خداؤں کا آدھا؟ تو پہلے دو خدا مانو، پھر اس کا آدھا مانو تو پھر ایک کھو۔ اب ہے کوئی دو خداؤں کو ماننے والا؟

☆ ۲۔ واحد ضمی کا معنی ہے کہ جس کی جہت وحدت جنس ہو، جیسے میں کہوں الحيوان واحد یعنی حیوان ایک ہے۔ خواہ وہ گدھا ہو یا کھوڑا، بکرا ہو یا بھینس کیونکہ حیوانیت جنس ہے اور وہ سب میں قدر مشترک ہے۔ مگر جنس تو فصل کے بغیر ہوتی نہیں اور جہاں جنس ہوتی ہے وہاں فصل بھی ضرور ہوگی۔ اب بتاؤ، خدا کو کیا کہو گے؟ کیا خدا کی کوئی جنس ہے؟ اگر جنس نہیں ہے تو پھر واحد ضمی کیسے کہو گے؟ خدا تعالیٰ چونکہ جنس سے پاک ہے اس لئے خدا کو واحد ضمی بھی نہیں کہہ سکتے۔

☆ ۳۔ واحد نوعی واحد کی تیسری قسم ہے یعنی ایسا واحد کہ جس کی وحدت مستعاد ہو جہت نوع سے، جیسے الانسان واحد یعنی انسان ایک ہے، خواہ کہیں کا رہنے والا ہو، مغرب کا ہو یا مشرق کا، نیک ہو یا بد کیونکہ انسان نوع ہے اور اس کی دو ذاتیات ہیں، "حیوان اور ناطق" دونوں کو ملاؤ تو انسان بنتا ہے۔ اب نوع نطق ہے جنس اور فصل کو ملا کر، مگر جنس اور فصل جہاں ملے گی وہاں ترکیب ہوگی اور جہاں ترکیب ہوگی وہاں حدوث ہوگا۔ اب بولو خدا حادث ہے یا قديم ہے؟ ہدایت اللہ تعالیٰ قدیم ہے۔ لہذا خدا تعالیٰ واحد نوعی بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ نوع سے پاک ہے۔

☆ اب بتاؤ! "الْهَيْكُلُ الْوَاحِدُ" کے کیا معنی کرو گے۔ وہ خدا ایک ہے، مگر کیا ایک ہے؟ وہ عدد کے اعتبار سے ایک ہے؟ جنس کے اعتبار سے ایک ہے یا وہ نوع کے اعتبار سے ایک ہے؟ ارے نہیں بتا سکتے۔

☆ یہاں پھر تمہیں چوتھی بات کہنی پڑے گی اور وہہ رائے سے کہنی پڑے گی اور کہنے والوں نے کہا کہ "الْهَيْكُلُ الْوَاحِدُ" تمہارا اللہ تو الہ واحد ہے، اس میں واحد کا لفظ حق ہے اور اس کے معنی بھی حق ہیں مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ دو کا آدھا ایک ہے یا اس کی جنس ایک ہے یا اس کی نوع ایک ہے، بلکہ اس واحد سے مراد ایسا واحد ہے جس کی جہت وحدت عین ذات ہو اور وہ از لا بد لہذا ضائع ذات ایک ہو، جس کا ایک ہونا از لا بد اور وجوباً ہو اور وہ کسی مرجع کی ترجیح کا محتاج نہ ہو۔

☆ اب بتاؤ! واحد کا یہ معنی تم کہاں سے لاؤ گے؟ کوئی قرآن کی آیت پڑھو کہ واحد کے یہ معنی ہوں یا کوئی حدیث لاؤ جس میں واحد کے یہ معنی درج ہوں۔ لالہ اکبر! پتہ چلا کہ تم تو تو حید کے مسئلہ میں بھی رائے کے بغیر زبان نہیں کھول سکتے۔

☆ اے تم امام ابو حنیفہ کو اہل الرائے کہتے ہو، میں کہتا ہوں کہ یہ رائے تو اجتہاد ہے اور خود حضور اکرم ﷺ نے اجتہاد فرمایا اور اسی

لئے فرمایا کہ اجتہاد کے جواز پر دلیل قائم ہو جائے اور پتہ چل جائے کہ مجتہد کا اجتہاد عین دین ہے، کیونکہ یہ مصطفیٰ کریم ﷺ کی ادا اس

کے لئے اصل ہے اور اسی لئے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اجتہاد کا موقع فراہم کیا۔

اگر اجتہاد نہ ہو تو دین چل نہیں سکتا کیونکہ ہزاروں مسائل ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ قرآن وحدیث میں بالوضاحت ان کا ذکر نہیں ہے۔



مثال کے طور پر ایک شخص نے بغیر چشمے کے ایک واقعہ دیکھا، دوسرے نے چشمہ لگا کر اور تیسرے شخص نے دوربین لگا کر اسی واقعہ کو دیکھا۔ اب بتاؤ چشمہ کے بغیر دیکھنا، چشمہ لگا کر دیکھنا اور دوربین کی مدد سے دیکھنا تینوں کا حکم ایک ہے یا کوئی فرق ہے؟ کسی نے کسی چیز کو بالمشافہ دیکھا، کسی نے اسے عکس کی صورت میں دیکھا، کسی نے پانی میں عکس دیکھا اور کسی نے آئینہ میں عکس دیکھا، ایک نے بالواسطہ دیکھا اور دوسرے نے بلاواسطہ دیکھا اب دیکھنا ان تمام میں مشترک ہے لیکن بتائیے ان سب کا حکم ایک ہے یا الگ الگ؟ اگر کہتے ہو کہ ان سب کا حکم ایک ہے تو میں کہوں گا تم رائے سے کہتے ہو اس کے لئے قرآن وحدیث سے کوئی دلیل لاؤ اسی طرح ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا کہ نماز ہوگی یا نہیں؟ اگر تم کہتے ہو ہوگی، تب بھی دلیل لاؤ اور اگر کہتے ہو نہیں ہوگی، تب بھی دلیل دینا ہوگا۔ لیکن من لقم جو کچھ بھی کہو گے، اپنی رائے سے کہو گے اور دس ہزار بار تم پر قیامت قائم ہو جائے تم اجتہاد کے بغیر دلیل نہیں لا سکتے اور اگر لاؤ گے تو امام ابو حنیفہ کے حجاج ہو کر رائے سے دلیل لاؤ گے۔

میں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ پر طعن کرنے والوں سے پوچھتا ہوں کہ تم ہر جگہ یہ کہتے پھرتے ہو کہ فلاں کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا تم کیوں کرتے ہو؟ یہ بدعت ہے اسی طرح جس کام کے لئے قرآن وحدیث میں کوئی دلیل نہ ہو، کہتے ہو، بدعت ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ احادیث نقل کرنے سے پہلے محدثین نے جو طریقہ اختیار کیا ہے، اسے کس خانہ میں رکھو گے؟ مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب ”المصابیح“ میں کوئی حدیث درج نہیں کی مگر پہلے میں نے نقل کیا اور دور رکھتے نقل پڑھے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ مقدمہ فتح الباری میں نقل کرتے ہیں ”قال البخاری ما کتبت فی کتاب المصباح حدیثاً الا اغتسلت قبل ذلک او صلیت رکعتین۔“ (۱)

اب میں پوچھتا چاہتا ہوں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس فعل پر کوئی دلیل لاؤ۔ کوئی حدیث پیش کرو جس میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہو کہ جب میری کوئی حدیث نقل کرو تو دور رکھتے نقل پڑھ لیا کرو۔ اب بتاؤ حدیث درج کرنے کا یہ طریقہ کہیں قرآن میں آیا ہے؟ یا کسی حدیث میں آیا ہے؟ معلوم ہوا کہ حدیث درج کرنے کا یہ طریقہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رائے سے اختیار کیا اور جس کام کے لئے قرآن وحدیث میں کوئی دلیل نہ ہو، کہتے ہو کہ بدعت ہے۔ اب بتاؤ کہ امام بخاری کا یہ عمل تم کس خانہ میں رکھو گے؟

لوگوں نے کہا کہ امام حافظ شمس الدین ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے میزان الاعتدال میں امام ابو حنیفہ کو ضعیف میں شمار کیا ہے۔ اللہ اکبر! میں پوچھتا ہوں کہ امام ذہبی کی یہی ایک تعریف ہے؟ اور یہ تذکرۃ الحفاظ کا مصنف بھی تو ذہبی ہے، اس تذکرۃ الحفاظ میں ذرا امام صاحب کا تذکرہ تو دیکھو۔ (۱) خدا کی قسم! ایمان تازہ کر دینے والا تذکرہ ہے اور پھر اسی تذکرہ میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں تو میں ابو حنیفہ کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھ سکا میں نے امام ابو حنیفہ کے مناقب میں ایک مستقل رسالہ لکھ دیا ہے (۲) حیرت ہے کہ پھر بھی یہ امام ذہبی پر تہمت لگاتے ہیں کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ کو ضعیف میں شمار کیا ہے۔ اسی طرح امام نسائی کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک امام ابو حنیفہ ضعیف السند ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جس امام کا دعویٰ یہ ہو کہ ضبط صدر کے بغیر ہم کسی کی روایت قبول نہیں کریں گے، اس پر یہ الزام کہ وہ ضعیف السند تھے کس قدر افسوس ناک ہے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ جو اہل حدیث نہ ہو، وہ اہلسنت نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آج تک مسلک کے اعتبار سے کسی کو اہل حدیث نہیں کہا گیا۔ اگر اہل حدیث کہا گیا تو محض فن کے اعتبار سے کہا گیا ہے، جسے علم اصول والوں کو اہل علم اصول کہا گیا، لکھنے والوں کو اہل قلم کہا گیا، منطق کا علم رکھنے والوں کو اہل منطق کہا گیا، اسی طرح خطا محدثین یعنی حدیث کا علم رکھنے والوں کو اہل حدیث کہا گیا، لیکن خدا کی قسم! مسلک کے اعتبار سے آج تک کوئی اہل حدیث نہیں ہوا۔ جن کے بارے میں بھی اہل حدیث کہا گیا ہے وہ محض فن کے اعتبار سے اہل حدیث کہا گیا کیونکہ اگر حدیث مسلک کی بنیاد ہوتی تو حضور ﷺ ”علیکم ہستی“ نہ فرماتے بلکہ ”علیکم بحديثی“ فرماتے مگر حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تو پتہ چلا کہ مسلک کی بنیاد حدیث نہیں ہو سکتی بلکہ مسلک کی بنیاد سنت ہے۔

اور میں عرض کروں کہ حدیث پر تم عمل نہیں کر سکتے کیونکہ حدیث مطلقاً قائل عمل نہیں ہے بلکہ سنت قائل عمل ہے۔ دیکھئے جو حضور ﷺ نے کہا وہ حدیث ہے، جو کیا وہ حدیث ہے اور جو آپ کے سامنے کیا گیا اور آپ نے اسے برقرار رکھا، وہ حدیث ہے لیکن آپ حدیث کو اپنے عمل کی بنیاد قرار نہیں دے سکتے کیونکہ حدیثوں میں تو اختلاف ہے، حدیثوں میں تعارض بھی ہے جیسا کہ میں نے پہلے مثال دی، ان میں تارض و منسوخ بھی ہیں۔ اس لئے حدیث قائل عمل نہیں ہے بلکہ اگر عمل کرنا ہے تو سنت پر عمل کریں گے کیونکہ سنت قائل عمل ہے۔ اگر کوئی عمل بالحدیث کا دعویٰ ہے تو میں بخاری شریف کی ایک حدیث پیش کرتا ہوں، کوئی آئے اور اس پر عمل کر کے دکھائے۔

بخاری شریف کی حدیث ہے

کان یصلی وهو حامل امامۃ بنت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۱)

یعنی حضور ﷺ نماز اس طرح پڑھتے تھے کہ آپ اپنی نواسی امامہ کو گود میں اٹھائے ہوئے تھے۔ اب بتائیے بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ اپنی نواسی کو گود



میں لئے نماز پڑھتے تھے۔ تو اب ذرا اس حدیث پر عمل کر کے دکھاؤ اور اپنی نواسیوں کو گود میں لے کر نماز پڑھا کرو اور اگر اپنی نہ ہو تو کسی کی اٹھلاؤ کیونکہ نواسی کے بغیر تو حدیث پر عمل نہیں ہوگا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ازواج مطہرات کے ساتھ حسن معاشرت کے طور پر جو طریقے اپنائے، کیا تم وہ طور طریقے اختیار کر سکتے ہو؟ یقیناً نہیں کر سکتے، تو معلوم ہوا کہ حدیث پر عمل ہو سکتا بلکہ سنت پر عمل ہو سکتا ہے اور سنت وہ ہے جسے میرے آقا حضور نبی کریم ﷺ نے ”مسلوک فی الدین“ قرار دیا ہو یعنی ”دین پر چلنے کا راستہ بتا دیا ہو۔ اسی لئے آپ نے ”علیکم بحدیثی“ نہیں فرمایا بلکہ ”علیکم بسننی“ (۱) فرمایا۔ لہذا اہم اہل حدیث نہیں بلکہ ہم اہل سنت ہیں اور میں یہ بتا دوں کہ دنیا میں دو ملت (تنہائی) خفی ہیں اور یہی سوا عظیم ہیں (۲) اب سچ بتاؤ حضورنا جد ارشد فی ﷺ کی امت کی اکثریت جس جانب ہوگی، وہ حق ہوگا۔ معمولی سی اقلیت حق پر ہوگی اور اے آقائے مآدارنا جد ارشد فی ﷺ میں آپ کی عظمتوں پر قربان جاؤں کہ آپ نے دین کو اتنا کامل اور روشن کر کے ہمارے سامنے رکھا اور فرمایا ”تس رککم علی ملۃ بیضاء“ ”لیلھا ونہارھا سواء“ (۳) یعنی تمہیں ایسی راہ پر چھوڑے جا رہا ہوں، جس کا دن رات واضح ہے، تم آنکھیں بند کئے چلے آؤ، مگر راہ نہ چھوٹے۔

انتہائی تھکان اور کمزوری کے باعث میری طبیعت انتہائی ناساز ہے، اس لئے انہی کلمات پر اکتفا کرتا ہوں اور میں دلائل کا اتنا انبار لگا دیتا کہ آپ من نہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ راہ نہ چھوٹے، جس پر تیرے نیک بندے گامزن ہیں۔

## شیخ الاسلام

### حضرت بہاؤ الدین زکریا علیہ الرحمۃ ملتانی

☆ حضرت غوث العالمین بہاؤ الحق والدین بزرگوار و معتمد المبارک ۵۶۶ھ جمعد کے دن مدینۃ الاولیاء ملتان کے نواح میں پیدا ہوئے اور بزرگوار و معتمد المبارک ۶۶۶ھ جمعد کے دن آپ کا وصال ہوا۔ اس طرح تقریباً ایک صدی تک آپ ملتان کے افضی سماء پر روحانیت، صالحیت، ولایت اور پاکیزگی کا آفتاب بن کر چمکے۔ آپ نے اپنی روحانیت اور ولایت سے صرف ملتان والوں کو نہیں بلکہ دور دراز تک کے لاکھوں مسلمانوں کو منور و مستفیض فرمایا۔

☆ ملتان آپ کے زمانے میں سندھ کا دار الخلافہ تھا اور اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ سندھ اور پنجاب دونوں سے برابر کا تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ حضور غوث العالمین سیدنا بہاؤ الدین زکریا کے فیوض و برکات جو ملتان سے ظاہر ہوئے، انہوں نے سندھ کی سر زمین کو بھی روشن کیا اور پنجاب بھی ان کے انوار و برکات سے محروم نہ رہا۔

### ظاہری و باطنی کمالات کا جامع

☆ حضرت غوث بہاؤ الدین زکریا اولیاء کبار میں شمار کئے جاتے ہیں اور آپ ایک ایسی جامع ہستی تھے، جنہوں نے اپنے اندر علوم ظاہری اور علوم باطنی کے تمام کمالات کو جمع کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام نعمتوں سے ان کو نوازا تھا۔ ظاہری نعمتیں بھی ان کو عطا فرمائیں اور باطنی نعمتوں سے بھی ان کو نوازا۔ آپ کے ہاں دولت دنیا کی بھی تھی اور دین کی دولت بھی آپ کے پاس بفضلہ تعالیٰ کثرت سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زراعت و تجارت کے ذریعے اموال کثیر عطا فرمائے اور مورخین نے لکھا ہے کہ آپ کی سالانہ اوسط آمدنی تقریباً پچھتر ہزار دینار تھی لیکن خزانہ عامرہ سے ہمیشہ غرباء و مساکین اور اہل حاجت پلٹے رہے اور آپ کا کثیر مال فقراء اور غرباء



پر صرف ہوتا رہا۔

## ولی کون؟

☆ آپ ولی کامل ہیں اور ولی ”ولا“ سے ماخوذ ہے۔ ”ولا“ سے مراد ہے ”محبت“ اور محبت سے یہاں خدا کی محبت مراد ہے جو کمال انسانی کا جو ہر ہے۔ اس لئے ولی خدا کا دوست اور محبت ہوتا ہے۔ اس کے دل میں خدا ہی کی محبت ہوتی ہے اور جس کے دل میں خدا کی محبت ہوتی ہے، وہ دنیا کی محبت اپنے دل میں نہیں رکھتا مال و دولت اور سیم و زر کی محبت اس کے دل میں نہیں ہوتی۔ حضرت غوث بہاؤ الحق والدین زکریا ملتانی باوجود اس کے کہ دولت دنیا سے بھر پور تھے لیکن آپ کے دل میں دولت دنیا کے لئے کوئی محبت نہ تھی۔

## نہ مال و دولت دنیا نہ رشتہ و پیوند

☆ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اتفاق ایسا ہوا کہ پانچ ہزار اشرافیوں کا کوئی صندوق گم ہو گیا۔ جب آپ کو بتایا گیا تو آپ نے فرمایا ”الحمد للہ“ کچھ دنوں بعد وہ صندوق دستیاب ہو گیا اور آپ سے عرض کیا گیا کہ حضرت! پانچ ہزار اشرافیوں والا صندوق مل گیا ہے تو آپ نے اس وقت بھی ارشاد فرمایا، ”الحمد للہ“ کسی نے آپ سے پوچھا، حضرت! اس وقت بھی آپ نے فرمایا تھا، ”الحمد للہ“ اور اب بھی آپ فرما رہے ہیں کہ ”الحمد للہ“ اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے جواب دیا، ”جس وقت مجھے اس صندوق کے گم ہونے کی اطلاع ملی تو میں نے اپنے دل کا جائز ملایا اور میں نے دیکھا کہ میرے دل میں اس صندوق کی گمشدگی کا کوئی ملال نہیں تھا۔ اس پر میں نے اللہ کی اس نعمت پر کہ میرا دل مال کی محبت سے پاک ہے، اللہ کا شکر ادا کیا اور جس وقت مجھے اس صندوق کے دوبارہ دستیاب ہونے کی خبر ملی تو اس وقت بھی میں نے اپنے دل کو ٹھٹھا اور محسوس کیا کہ میرے دل میں اس کے ملنے کی کوئی خوشی نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ میں نے اس وقت بھی ”الحمد للہ“ پڑھا۔ کیونکہ میرا دل اس وقت بھی دنیا کے مال کی محبت سے خالی تھا اور اس میں اللہ کی محبت کے سوا کسی اور کی محبت نہ تھی۔

## شان ولایت

☆ مختصر یہ کہ ولایت کی شان یہ ہے کہ اللہ کی کامل محبت انسان کے دل میں پائی جائے اور جس کے دل میں اللہ ہی کی محبت ہوگی تو وہ جو کام بھی کرے گا، اللہ کی محبت کے لئے کرے گا کیونکہ جہاں خدا کی محبت ہو وہاں تو اطاعت کی محبت پائی جائے گی۔ وہاں تو حب حسنت اور حب خیرات ہوگی اور حب شہوات سے وہ بالکل پاک ہوگا۔ کیونکہ حب شہوات تو ان دلوں میں پائی جاتی ہے جو دل خدا کی محبت سے خالی ہوتے ہیں اور اولیاء اللہ تو خدا کی محبت کا مرکز ہوتے ہیں۔ ان کی پوری شخصیت خدا کی محبت سے رنگی ہوئی نظر آتی ہے اور خدا کی محبت سے ان کے قلوب بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فطرت اور ان کی طبیعت دنیوی امور کی محبت سے بالکل پاک ہوتی ہے اور وہ اللہ کا ذکر اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں اللہ کے ذکر میں لذت آتی ہے۔

## علم کی تلاش

☆ حضور سیدنا غوث بہاؤ الدین زکریا ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی علوم میں بھی پوری دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے علم کے حصول کے لئے دیا ر و امعار کا سفر اختیار کیا۔ آپ خراسان، عراق اور حجاز مقدسہ پہنچے اور وہاں اپنے زمانہ کے نامور علماء سے مروجہ علوم حاصل کئے۔ بالخصوص علم حدیث آپ نے ایسے اساتذہ سے حاصل کیا جو یکتائے زمانہ تھے۔

## شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات

☆ تلاش مرشد میں آپ بغداد پہنچے اور یہاں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے کل سترہ دن ان کے پاس قیام فرمایا اور سترہ دن بعد ہی شیخ شہاب الدین سہروردی نے آپ کو فرقہ خلافت عطا فرمایا جو اصحاب پہلے سے ان کی خدمت میں مامور تھے، انہیں یہ دیکھ کر بڑا رشک آیا اور انہوں نے سوچا کہ ہم مدت سے یہاں موجود ہیں اور اس دولت سے محروم ہیں لیکن حضرت بہاؤ الدین زکریا کو یہ دولت فقط سترہ دنوں میں عطا کر دی گئی۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کو جب معلوم ہوا تو آپ



نے فرمایا تم گیلی لکڑی کی طرح ہو جب کہ بہاؤ الدین زکریا خشک لکڑی کی مانند ہیں جو بہت جلد آگ کو پکڑ لیتی ہے اور اس آگ سے مراد آتش عشق الہی ہے۔ کیونکہ اللہ کا عشق ہی تو ولایت کی حقیقت ہے۔

## تبلیغ و اشاعت

☆ شیخ شہاب الدین سہروردی سے روحانی فیوض حاصل کرنے اور خرقہ خلافت پانے کے بعد آپ نے سہروردی سلسلے کو ملتان میں قائم فرمایا، جس سے لاکھوں افراد نے فیوض و برکات حاصل کئے۔ تمام دیا رومعار میں آپ کی تعلیمات پھیلیں۔ آپ نے روحانیت کے علوم کو بھی پھیلایا اور ظاہری علوم کو بھی آپ نے فروغ دیا۔ آپ نے ملتان میں علوم اسلامیہ کا ایک عظیم الشان دارالعلوم بھی قائم کیا، جس میں اس وقت کے بڑے بڑے علماء کے علاوہ ماوراء النہر تک سے طلباء کو بلایا گیا۔ اس طرح رشد و ہدایت اور توحید دین کا ایک عظیم سلسلہ یہاں قائم ہوا۔

## تصنیف و تالیف

☆ آپ نے کئی ایک کتابیں بھی تصنیف فرمائیں لیکن اوراد کے متعلق جو کتاب آپ نے تحریر کی، وہ اب بھی پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ آپ کی ایک اور مشہور کتاب ”بہائے“ ہے جو اگرچہ دستیاب نہیں ہوتی لیکن مختلف ادوار میں اہل علم نے اس کتاب سے استفادہ کیا۔ جس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

## تعلیمات

☆ حضرت غوث بہاؤ الدین زکریا ملتانی کی تعلیمات میں خصوصیت کے ساتھ جو چیز پائی جاتی ہے جیسا کہ اخبار الاخیار میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور دیگر مورخین نے بھی لکھا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ جل مجدہ کی محبت کو ترقی دی جائے اور اپنے قلب کو اس کی محبت اور اس کی یاد سے حرارت پہنچائی جائے اور اللہ کا ذکر بکثرت کیا جائے۔ رسول کریم ﷺ کی اطاعت کو اپنا شعار بنایا جائے۔ غرباء و مساکین کے ساتھ رحمہ لی سے پیش آیا جائے اور جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ مال و دولت عطا فرمائے، وہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔

## حق بحق رسید

☆ آپ جس وقت دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے تو آپ کے بڑے صاحبزادے کی خدمت میں کسی شخص نے ایک سر بمبر خط پیش کیا اور کہا کہ آپ حضرت غوث بہاؤ الدین زکریا کو یہ خط دے دیجئے چنانچہ وہ خط بڑے صاحبزادے لے کر آئے اور آپ کو پیش کیا اور جس وقت وہ خط دے کر واپس لوٹے تو دیکھا کہ وہ قاصد موجود نہ تھا۔ آپ سخت متعجب ہوئے۔ اسی وقت آپ کے کان میں آواز آئی ”حق بحق رسید“ یعنی بہاؤ الحق حق تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ اس آواز کو سن کر جب وہ اندر پہنچتے دیکھا کہ حضور غوث بہاؤ الحق زکریا ملتانی کی روح مبارک فحش غصری سے پرواز کر چکی ہے۔

☆ آپ کے وصال کے بعد آپ کی اولاد خصوصاً آپ کے صاحبزادے حضرت صدر الدین عارف اور پوتے حضرت شاہ رکن عالم نوری حضوری نے آپ کے مشن کو آگے بڑھایا اور انہوں نے ولایت کے انوار و برکات کو سر زمین ملتان اور دور دراز کے علاقوں تک پھیلایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ علم و شرف عطا کیا، جس سے تمام اہل علم واقف ہیں۔ آج تک آپ کے فیوض و برکات جاری ہیں اور سارے دیا رومعار خصوصاً سندھ سے لوگ بکثرت حاضر ہو کر آپ سے فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بزرگان دین کی تعلیمات پر عمل پیرا رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں ان کی فیوضات سے نوازے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

☆ درج ذیل درود شریف کا ایک بار پڑھنا چالیس مرتبہ دلائل الخیرات پڑھنے کے برابر ہے۔  
اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی آلِهِ وَ اصْحَابِهِ وَ اَزْوَاجِهِ وَ ذُرِّيَّتِهِ وَ اَهْلَ بَيْتِهِ عِدَّةً مَا فِي عِلْمِكَ صَلَوةً دَائِمَةً بَدَوَامَ مُلْكِكَ (جامع الصلوٰۃ - ص ۱۹)  
☆ شیخ عبدالقادر بغدادی الصدیقی نے فرمایا معصائب کے وقت درج ذیل درود و سلام کو ایک ہزار بار پڑھنا تریاق مجرب ہے۔



الصلوة والسلام عليك يا سیدی یا رسول اللہ قد ضاقت حبلتی ادرکنی (افضل الصلوة۔ ص ۱۵۵)

☆ عارف مری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جس نے دن اور رات میں پانچ سو مرتبہ اس درود شریف پڑھنے کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دیدار سے جاگتے ہوئے مستفیض ہو کر مرے گا، پہلے نہیں۔ وہ درود شریف یہ ہے

اللہم صل علی سیدنا محمد عبدک ونبیک ورسولک النبی الامی وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔ (افضل الصلوة۔ ص ۶۶)

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، جس نے جمعہ کے دن بعد نماز عصر کے اٹھنے سے پہلے اسی مرتبہ پڑھا، اس کے اسی سال کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں اور اسی سال کی عبادت لکھی جاتی ہے۔ درود شریف یہ ہے

اللہم صل علی سیدنا محمد النبی الامی وعلی آلہ وسلم تسلیما

☆ حضور ﷺ پر جس نے یہ درود شریف ”صلی اللہ علی محمد“ پڑھا اس نے اپنے اوپر ستر دروازے رحمت کے کھول دیئے۔ اللہ تعالیٰ اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دے گا تو اس سے بغض نہ رکھے گا، گروہ نہ جس کے دل میں نفاق ہے۔ (کشف الغمہ للعمرانی) حضرت حافظ خاوی کی روایت میں ہے کہ اس درود شریف کو سات ہفتے تک پڑھنے والا دیدار سے شرف ہوگا۔ حتیٰ کہ حدیثیں روایت کرے گا اور اس کی تائید میں ایک سنا بیٹے کا ذکر بھی کیا۔

## وسیلہ قرب الہی

☆ محترم حضرات! سیدنا حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی مبارکباد کے سلسلہ میں اس تقریب سعید کا اہتمام کیا گیا ہے اور حضرات اولیاء کرام بالخصوص سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی تعلیمات اور ان کے فووض و برکات اور ان کی کرامات کا ذکر اس جلسے کا موضوع ہے۔

☆ نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ قرآن و حدیث کی روشنی میں گفتگو کروں گا۔ قبل اس کے کہ میں اس آیت کریمہ کا ترجمہ کروں اور اپنے موضوع پر گفتگو کروں، یہ بتا دینا ضروری لگتا ہوں کہ اولیاء اللہ کی محبت اللہ کی محبت سے کوئی جدا گانہ چیز نہیں ہے اور اولیاء اللہ کے کمالات اور ان کے ارشادات اور ان کی مقدس تعلیمات کتاب و سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ کتاب و سنت کی تعلیمات کا جو خلاصہ ہے، وہ حضرات اولیاء اللہ کی تعلیمات میں پایا جاتا ہے اور کتاب و سنت نے جن امور کو انسانیت کا کمال قرار دیا ہے، وہی امور بطور کمالات حضرات اولیاء کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذوات قدسیہ میں پائے جاتے ہیں۔ اولیاء کی محبت عین اللہ کی محبت ہے اور یہ صحیح ہے، اولیاء کی تعلیم عین اللہ کی تعلیم ہے۔ اولیاء کی تعلیمات عین اللہ کی تعلیمات ہیں اور مجھے کہنے دیجیے اولیاء کے کمالات جلوہ ہیں کمالات الوہیت کا اور تجلی ہیں جمال الوہیت کی۔ خدا کے کمال الوہیت اور جمال الوہیت سے الگ مستقل حیثیت میں ہم کوئی چیز اولیاء کے لئے ثابت نہیں کرتے اور ہم تو اولیاء کرام کو کسی اور نسبت کی بنا پر تسلیم نہیں کرتے بلکہ اولیاء اللہ کو ہمارا ماننا، ان کو تسلیم کرنا، ان سے محبت اور عقیدت رکھنا، صرف اور صرف اس لئے ہے کہ وہ اولیاء اللہ ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ محبوب کا محبوب، محبوب ہوتا ہے۔

☆ اللہ ہمارا محبوب ہے اور اولیاء اللہ کے محبوب ہیں۔ جب یہ اللہ کے محبوب ہیں تو ہمارے بھی محبوب ہیں۔ دوست کے دشمن کو ہم



اپنا دوست نہیں بنا سکتے اور دوست کے محبوب کو ہم اپنا دشمن قرار نہیں دے سکتے۔ جس شخص کو ہمارے دوست سے عداوت ہے۔ وہ کبھی ہمارا محبوب نہیں بن سکتا اور جس شخص کو ہمارے دوست سے محبت اور غلوں ہے، وہ کبھی ہمارا دشمن نہیں بن سکتا۔

☆ ہم اولیاء اللہ کو محض اس لئے مانتے ہیں کہ وہ اللہ والے ہیں اور ان کا ماننا دراصل اللہ کا ماننا ہے۔ ان کو اللہ سے کوئی نسبت نہ ہوتی تو ہمارا ان سے کیا تعلق تھا؟ ہمارا تعلق تو محض اس لئے ہے کہ وہ اللہ والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان بزرگوں کی یاد مانتے ہیں۔

☆ حضور غوث پاک نہ صرف اللہ کے ولی ہیں بلکہ اولیاء کے سردار ہیں۔ اگر ہم ان کی یاد میں کوئی جلسہ منعقد کرتے ہیں، عرس مناتے ہیں، فاتحہ و نیاز کا اہتمام کرتے ہیں تو یہ تمک تقسیم کرتے ہیں، فقط اس لئے کہ یہ اللہ والے ہیں۔ اللہ سے ان کی نسبت ہے۔ اولیاء سے نسبت رکھنا اللہ سے نسبت رکھنے کی دلیل ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ والے اولیاء کا دن مناسکتے ہیں اور جو اللہ والا نہ ہو، اس کا اولیاء سے کیا تعلق؟ اولیاء سے تعلق اللہ والا ہونے کی دلیل ہے اور اللہ سے تعلق کی دلیل ہے۔ اولیاء سے محبت اللہ سے محبت کی دلیل ہے۔ اولیاء کی تعظیم اللہ کی عظمت کے اعتقاد کی دلیل ہے۔ اولیاء سے قرب اللہ کے قرب کے حصول کی دلیل ہے۔ جن لوگوں نے اولیاء سے علیحدگی اختیار کی، انہوں نے اللہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور اللہ کا قرب اولیاء کا قرب ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات سمجھ نہیں آتی؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ب: ۲۶، س: ۱۶، آیت: ۱۶)

ترجمہ ☆ ہم تو ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ ان سے قریب ہیں۔

☆ اب ولی کی چیخ میں کیا ضرورت ہوگی؟ اللہ تو فرماتا ہے کہ ہم شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ بات تو ختم ہوگئی؟  
☆ اب ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کریں۔ حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے، حضرت محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کریں۔ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے، جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ

☆ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے کسی ولی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا خدا خود ہم سے قریب ہے۔ وہ ہماری بات کو سنتا ہے، ہمیں دیکھتا ہے اور ہمارے دل کی بات کو جانتا ہے۔ وہ ہمارا سمجھ و بصیر ہے اور ہمارے حالات کا علم و خبر ہے اور ہم سے قریب ہے تو ان اولیاء کرام کی درمیان میں کیا ضرورت پڑ گئی۔ یہ ہمیں خدا کے قریب کیسے کریں گے؟ بلکہ یہاں تک بات سامنے آگئی کہ یہ مشرکوں کا عقیدہ تھا۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى (ب: ۲۳، س: الزمر، آیت: ۳)

ترجمہ ☆ ہم جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ یہ ہمیں خدا سے قریب کر دیں گے۔

☆ تو معلوم ہوا کہ کسی کو خدا سے قریب کرنے کا عقیدہ رکھنا، یہ تو مشرکوں کا عقیدہ ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ کہاں گیا ہے؟ ہمارا خدا تو ہم سے قریب ہے۔ لہذا ہمیں کیا ضرورت ہے کہ کسی کو خدا کے قرب کا وسیلہ اور ذریعہ بنائیں؟ یہ کیسی بات ہوگی؟ یہاں میں ایک بات عرض کروں۔ سنئے، پہلی بات تو یہ ہے، یہ کہنا کہ مخلوق کسی بندے کو اللہ تعالیٰ کے قریب نہیں کر سکتی، یہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کیوں فرماتا

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا (س: احزاب، آیت: ۴۵)

☆ ”پیارے حبیب ﷺ ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا۔ مبشر بنا کر بھیجا۔ ہم نے آپ کو نذیر بنا کر بھیجا۔ ہم نے آپ کو اپنے حکم سے

اپنے بندوں کو اپنی طرف بلانے والا بنا کر بھیجا۔“ اللہ اکبر! اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ حضور نبی اکرم ﷺ جب اللہ کے بندوں کو

اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلائیں گے تو اللہ کے بندوں کو اللہ سے قریب کریں گے کہ نہیں؟ تو یہاں

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ

☆ آپ کو یاد نہیں آیا۔ خدا خود سمجھ و بصیر ہے۔ وہ خود ہی اپنے بندوں کو اپنی طرف متوجہ کر لے



وَدَاعِبَنَا إِلَى اللَّهِ بِادْبِهِ

☆ کی کیا ضرورت ہے؟ اگر نبی کا آنا کسی حکمت پر مبنی ہو سکتا ہے تو اولیاء کا وجود بھی حکمت پر مبنی ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کا تشریف لانا بھی خدا کے قرب کے منافی نہیں اور اولیاء اللہ کا مدارے لئے وسیلہ قرب خداوندی ہونا بھی اس آیت کے منافی نہیں۔ اب میں آپ کو شرکین کے اس قول  
مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى (س زمر آیت ۳)  
☆ کی حقیقت بتاتا ہوں۔

☆ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان (باطل) معبودوں کی لات کی، عزلی کی، منات کی، ہبل کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔ بالکل ٹھیک ہے شرکین بھی کہتے تھے۔ کم از کم ”مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا“ کا ترجمہ سمجھو (ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کرتے ہیں) بھائی کسی کے لئے عبادت تو کریں۔ عبادت تو کرتے ہیں اور عبادت بھی بتوں کی کرتے ہیں۔ کس لئے کرتے ہیں؟ یہ علیحدہ چیز ہے کہ ان کی غرض کیا ہے؟ مقصد کیا ہے؟ مگر وہ بتوں کی عبادت کے قائل ہیں۔

☆ الْحَمْدُ لِلَّهِ! ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا معبود سوائے اللہ کے کوئی نہیں ہے۔ ہم نہ حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت کرتے ہیں، نہ ہم حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت کرتے ہیں، نہ ہم حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت کرتے ہیں۔ ہم کسی بھی ولی کی عبادت نہیں کرتے۔ ہم کسی نبی کی عبادت نہیں کرتے۔ اگر خدا کے سوا کسی کی عبادت کرتے تو محمد ﷺ کی عبادت کرتے۔ مگر ہم ان کی بھی عبادت نہیں کرتے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى

☆ مشرکین کہتے ہیں، ہم ان کی عبادت کرتے ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کرنا یہی تو شرک ہے اور ہم کسی کی بھی عبادت نہیں کرتے اور کسی کے لئے بھی نہیں کرتے۔ یہاں دو باتیں ہیں۔ ایک مشرکین غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ دوسرے اس لئے کہ وہ انہیں خدا سے قریب کر دیں۔ میں پوچھتا ہوں، کیا بتوں میں خدا سے قریب کرنے کی صلاحیت تھی؟

☆ بتوں میں خدا سے قریب کرنے کی صلاحیت تھی اور نہ وہ معبود ہو سکتے تھے۔ کیونکہ معبود تو صرف ایک ہی ہے۔

☆ اول تو یہ کہ ہم اولیاء کی عبادت نہیں کرتے۔ پھر یہ کہ اگر ہم انہیں قرب الہی کا وسیلہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں تو کیا واقعی یہ قرب کا وسیلہ اور ذریعہ بننے کے اہل ہیں۔ اور بتوں میں یہ اہلیت کہاں تھی؟ وہ وسیلہ قرب الہی ہونے کے لئے صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کے ماننے والے ان کی عبادت کرتے تھے۔ اور ہم اولیاء اللہ کو ماننے والے ان کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ اور اولیاء اللہ خدا کی بارگاہ میں قرب کا وسیلہ ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

☆ اب رہی یہ بات کہ ایک مخلوق کیسے وسیلہ ہو جائے گی اور وہ اپنے آپ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وسیلے کے معنی ہیں

مَا يَتَوَسَّلُ بِهِ إِلَى الشَّيْءِ

☆ وہ چیز وسیلہ ہوتی ہے، جس کے ذریعے ہم کسی تک پہنچیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں کسی وسیلہ کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ وہ عالم الغیب ہے، عالم الشہادت ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، خیر ہے، قدير ہے اور قریب ہے۔

☆ اب اس کی بارگاہ میں وسیلے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا حاجت ہے؟ اللہ کی ذات تو اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے اور اپنے درمیان ہم کسی چیز کو وسیلہ بنائیں۔ مخلوق تو وسیلہ بن نہیں سکتی کیونکہ

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ

☆ اس کی شان ہے۔

☆ یہاں ایک بات عرض کرنا ہوں۔ پہلے قرآن کی صاف آیت ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (ب: ۶ س: المائدہ، آیت ۳۵)

ترجمہ ☆ میرے بندو! اللہ کی طرف کوئی وسیلہ ڈھونڈو۔



☆ میری بات نہیں۔ قرآن ہے۔ حدیث بھی نہیں ہے، جس کو لوگ ضعیف کہہ دیں یا غلط کہہ دیں۔ یہ تو قرآن کی آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے  
وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ

☆ اس کی طرف کوئی وسیلہ ڈھونڈو تو آپ بتائیں اللہ نے ہمیں وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا یا نہیں۔ تو جس چیز کا حکم خود خدا تو اس کو شرک کہنے والا پھر کون ہوگا؟ رہا یہ امر کہ وسیلے سے مراد یہاں اولیاء اللہ تھوڑے ہی ہیں؟ نماز ہے، حج ہے، روزہ ہے، زکوٰۃ ہے، اعمال صالح ہیں۔ تم نے اولیاء کو وسیلہ بنالیا، یہ کیا بات ہوئی۔

☆ اگر یہ بات کہی جائے تو یہ اس سے بھی زیادہ غلط بات ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ بات یہ تھی کہ مخلوق ہمارے اور خالق کے درمیان وسیلہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے یا نہیں۔ جب وہ

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ

☆ ہونے کی شان رکھتا ہے پھر مخلوق ہمارے اور اس کے درمیان وسیلہ بنے؟ یہ بات غلط نہیں۔ یہاں پوچھتا ہے چاہتا ہوں کہ جب کوئی بھی مخلوق وسیلہ نہیں تو یہ بتاؤ کہ اعمال مخلوق ہیں یا خالق۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے  
وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ (س صافات آیت ۶۱)

☆ ”اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارا کیا عمل کو ایمان سے کہنا اعمال خدا کی مخلوق ہیں یا نہیں؟ میں بڑی حیرت میں مبتلا ہوں کہ اعمال جو مخلوق ہے، وہ وسیلہ ہو سکتے ہیں اور وہ شخص جو اعمال صالح کا قائل ہو وسیلہ نہیں ہو سکتا۔

☆ اعمال صالحہ قرآن کی روشنی میں ہم بے شک وسیلہ مانتے ہیں مگر یاد رکھو عمل تو کوئی چیز نہیں ہے، وہ تو ایک عرض ہے۔ ایک امر مستوی ہے، وہ تو خود پایا نہیں جاتا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ نماز کہیں پائی جاتی ہے؟ بھائی نماز کہیں پائی جائے گی تو وہ نمازی میں پائی جائے گی، نمازی نماز پڑھے گا تو نماز کا وجود ہوگا۔ نمازی نہ ہو تو قیام کہاں ہوگا، رکوع کہاں ہوگا، سجود کہاں ہوگا؟ نمازی کا جسم کھڑا ہے تو قیام ہے، نمازی کا جسم جھکا ہے تو رکوع ہے، نمازی نے سر زمین پر رکھا ہے تو وہ سجدہ ہے۔  
☆ نمازی نہ ہوگا تو نماز کہاں ہوگی؟ ہم اولیاء اللہ کو وسیلہ اس لئے کہتے ہیں کہ اعمال صالح کا وجود عامل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ورنہ نمازی سے الگ ہو کر نماز کو ڈھونڈو۔

☆ روزہ دار تو دنیا میں کوئی نہ ہو اور روزہ آپ کو مل جائے۔ کہاں ملے گا؟ اور حج بولنے والا کوئی نہ ہو تو حج آپ کو کہاں ملے گا؟ اور قرأت قرآن کرنے والا کوئی نہ ہو تو آپ کو تلاوت کہاں ملے گی؟ کوئی بھی نیک عمل نہیں مل سکتا جب تک اس نیک عمل کو کوئی کرنے والا نہ ہو تو عزیز دوستو! اعمال صالح کا وجود بغیر کرنے والے کے تحقق نہیں ہوتا۔

☆ ہم اولیاء کرام کی ذوات قدسہ کو جو وسیلہ مانتے ہیں تو وہ اعمال صالح سے الگ متصور کر کے وسیلہ نہیں مانتے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اعمال صالحہ کے عامل ہیں نمازی ہیں، حاجی ہیں، روزہ دار ہیں، زکوٰۃ دینے والے ہیں۔ اللہ کا ذکر کرنے والے ہیں، عبادت گزار ہیں۔ ہم ان کے اعمال کی وجہ سے ہی تو انہیں وسیلہ مانتے ہیں۔

☆ اور ان کو وسیلہ مانتا دراصل اعمال ہی کا وسیلہ مانتا ہے۔ خدا کی قسم! یہ وسیلے کا حکم میں نے نہیں دیا بلکہ خود خدا نے دیا ہے۔ اعمال صالح کو میں اصل اور بنیاد مانتا ہوں۔ مگر یاد رکھیے، اولیاء اللہ کو وسیلہ قرار دینا انہی اعمال کی بنیاد پر ہے۔ اگر اعمال کا تصور ہٹالیا جائے تو پھر اولیاء کا وسیلہ وسیلہ نہیں۔

☆ ابھی میں نے آپ کو بتایا کہ ہم ولی کو ولی مانتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ اللہ والا ہے۔ وہ اللہ والا کب ہے؟ جب وہ روحانیت سے سرشار ہے۔ جب وہ عبادت گزار ہے، اللہ والا کب ہے؟ جب وہ اللہ کی محبت والا ہے، جب ہی تو وہ اللہ والا ہے۔

☆ اللہ کی محبت نیک عمل ہے۔ یہ روحانیت، یہ تقویٰ، یہ ریاضت، یہ طہارت، یہ مجاہدہ، یہ شب بیداری، یہ عبادت گزاری۔ یہ کیا ہیں؟ یہ نیک اعمال ہیں اور یہ نیک اعمال کرنے والے اولیاء اللہ ہیں۔ پھر ان کا وسیلہ ہونا، یہ اعمال صالح کی جہت سے ہے تو ذرا عقل



سے کام لیا اور سوچو اس لئے تو میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ بات تو ثابت ہے کہ کوئی نیک عمل اس وقت تک وسیلہ نہیں، جب تک کہ اس کا تعلق کسی نیک کی ذات سے نہ ہو۔ آپ سے پوچھتا ہوں، منافق نماز پڑھتے تھے یا نہیں؟ کلمہ پڑھتے تھے یا نہیں؟

☆ تو میرے پیارے دوستو! کیا ان کی نماز ان کے لئے وسیلہ تھی؟ کیا ان کا کلمہ ان کے لئے وسیلہ تھا؟ ہرگز نہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ منافق وہ نماز پڑھتے تھے، جس نماز کی کوئی نسبت پیارے مصطفیٰ سے نہ تھی تو پتہ چلا کہ کلمہ اس وقت تک کلمہ نہیں، جب تک کہ اس کی نسبت کلمہ لانے والے کی ذات سے نہ ہو اور نماز اس وقت تک نماز ہے ہی نہیں، جب تک کہ نماز لانے والے کی ذات سے اس کا تعلق نہ ہو۔ ورنہ نقالی ہوگی اور نقالی کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں ہے۔

☆ یہی فرق ہے اتباع میں اور نقالی میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ”فَاتَّبِعُونِي“ ”میرے محبوب کی اتباع کرو۔“ اتباع کے معنی یہ ہیں کہ میرے محبوب کی محبت میں اس قدر مستغرق ہو جاؤ کہ ان کی محبت کے تقاضے کی بنا پر تم ان کی اداؤں کے سانچے میں ڈھل جاؤ۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو عمل حضور نے کیا تم بھی کر لو۔ تمہاری نجات ہو جائے گی۔ نماز حضور نے پڑھی، قیام فرمایا، رکوع فرمایا، سجدہ فرمایا۔ اور یہ سارے اعمال منافق بھی کرتے تھے مگر ان کی نجات نہیں ہوئی۔ کیوں نہیں ہوئی؟ اس لئے کہ منافقین کا کوئی عمل بھی حضور کی محبت کی بنیاد پر نہ تھا۔ لہذا وہ اعمال صالح کی بنیاد بھی قرار نہ پاتے۔

☆ اس لئے منافقین کی نمازوں کو ہم اتباع رسول نہیں کہہ سکتے۔ اتباع رسول کس کی نماز تھی؟ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی، سیدنا محمد اکرم اللہ وجہہ الکریم کی، اہل بیت اطہار کی، صحابہ کبار کی، ازواج مطہرات کی، تابعین کی، تبع تابعین کی، سلف صالحین کی، مشائخ کرام کی اور اولیاء اللہ کی۔

☆ ان حضرات کی جو عبادت تھی، خدا کی قسم! وہی عبادت ہے، وہی طاعت ہے، وہی نماز، ان کی سب نیکیاں حضور ﷺ کی اتباع ہے اور جو حضور کی نسبت اور محبت سے خالی ہو، وہ اگر قیام بھی کرے، رکوع بھی کرے، سجدہ بھی کرے، کچھ بھی کرے، کوئی فائدہ نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا

سِبْأَتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ وَلَا يَبْقَى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رِسْمُهُ يَقْرَأُونَ الْقُرْآنَ وَلَا يَتَجَاوَزُ الْقُرْآنَ عَنْ حَنَاجِرِهِمْ

☆ پھر فرمایا

وَفِي رِوَايَةٍ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهَدْيِ يَمُرُّونَ مِنَ الدِّينِ كَمَا يَمُرُّ السُّهُمُ مِنَ الرِّمِيَةِ فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاكُمْ لَا يَصِلُونَكُمْ وَلَا يَفْتَنُونَكُمْ وَفِي رِوَايَةٍ لَتَحْقِرُونَ صَلَواتَكُمْ بِصَلَاةِهِمْ

☆ حضور ﷺ نے فرمایا، ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اسلام کا نام رہ جائے گا۔ قرآن کی رسم رہ جائے گی۔ وہ قرآن پڑھیں گے مگر حلق سے نہیں اترے گا۔ کیسے اترے گا؟ حضور ﷺ کی محبت کے بغیر تو قرآن حلق سے نہیں اترتا۔ فرمایا، ”لوگ نمازیں پڑھیں گے ایسی کہ تم اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلے میں حقیر سمجھو گے۔“ تم کہو گے، ہماری تو کچھ نمازیں نہیں، نمازیں تو ان کی ہیں، بڑی لمبی نمازیں پڑھتے ہیں۔ فرمایا، تمہیں اپنی نمازیں ان کی نمازوں کے مقابلے میں حقیر نظر آئیں گی۔“ فرمایا، ”ان کی مسجدیں آباد اور نمازیوں سے کچھ کچھ بھری ہوں گی، مگر حال یہ ہوگا، ”يَمُرُّونَ مِنَ الدِّينِ كَمَا يَمُرُّ السُّهُمُ مِنَ الرِّمِيَةِ“ ”وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کے جانور میں داخل ہو کر پھر نکل جاتا ہے اور شکار کے گوشت پوست کا اور خون کا تیر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔“ بالکل اسی طرح یہ لوگ دین میں داخل ہو کر نکل جائیں گے۔ دین کی کوئی برکت، نورانیت اور روحانیت ان کے اندر نہیں پائی جائے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا، ”ان کی مسجدیں آباد ہوں گی لیکن ہدایت سے وہ ان ہوں گی۔ نمازی ہوں گے، نمازیں بھی پڑھیں گے، مگر ہدایت کا نام نشان نہ ہوگا۔“ کیوں؟ اس لئے کہ وہ حضور ﷺ کے متبع نہ ہوں گے۔ صرف نقل کرنے والے ہوں گے۔ نقالی اور چیز ہے، اتباع اور چیز۔ نقالی سے نجات نہیں ہوتی، اتباع سے نجات ہوتی ہے اور اتباع وہ چیز ہے، جس میں متبوع کے ساتھ رابطہ ہو، نسبت ہو، تعلق ہو، لگاؤ ہو، محبت ہو۔ جب کوئی عمل صالح، صالح کی ذات سے نسبت کے بغیر عمل صالح قرار نہیں پاتا تو صالحین کو نظر انداز کر کے اور صرف اعمال کی ظاہری شکل و ہیئت کو وسیلہ قرار دے دیتا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ

”اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔“

☆ ترجمہ



## شبہ اور اس کا ازالہ

☆ اب آپ کا یہ تصور کہ بھائی جب اللہ قریب ہے تو خدا کے قریب ہونے کے لئے وسیلے کی کیا ضرورت ہے؟ تو میں عرض کرتا ہوں، خدا سب کے قریب ہے کہ نہیں؟ یہ ہمارا ایمان ہے کہ خدا علماًً قدراً سب کے قریب ہے اور کائنات کے ذرہ ذرہ پر خدا محیط ہے اور کائنات مخاطب ہے۔ از روئے علم، از روئے قدرت، از روئے احاطہ، خدا سب کے قریب ہے اور خدا کسی سے دور نہیں۔ خدا ہر ایک کے قریب ہے، مگر خدا کے قریب کوئی کوئی ہے۔ شاید آپ دل میں یہ بات سوچیں کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب خدا سب کے قریب ہے تو پھر سب خدا کے قریب کیوں نہیں بلکہ کوئی کوئی ہے۔ ایک بات پوچھتا ہوں۔ یہ بتائیے، خدا کافروں کے ساتھ ان کی شررگ سے بھی زیادہ قریب ہے کہ نہیں؟ خدا ابو جہل کے قریب تھا کہ نہیں؟ اور اسی طرح ابولہب، عتبہ، شیبہ، کعب بن اشرف اور رئیس المنافقین عبد اللہ ابن ابی، یہ جتنے کفار، مشرکین اور منافقین ہیں، کیا اللہ ان کی شررگ سے زیادہ قریب نہیں تھا؟ پھر یہ بتائیے کہ یہ سب خدا کے مقربین ہیں؟ ابو جہل کو، عتبہ اور شیبہ کو خدا کا مقرب مانو گے؟ ہرگز نہیں۔ بے شک خدا تو ان کے قریب تھا، مگر وہ خدا کے قریب نہیں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا سب کے قریب ہے، مگر خدا کے قریب ہر ایک نہیں ہو سکتا۔ ابھی بات سمجھ نہیں آئی تو پھر میں بات سمجھائے دیتا ہوں۔ خدا کے قرب کا قیاس اپنے قرب پر کرنا یہ تو بالکل قیاس مع الفارق ہے۔ وہ تو زمان و مکان اور مسافت سے پاک ہے

فَتَأْتِي اللَّهُ عَنْ ذَٰلِكَ غُلُوبًا كَثِيرًا

☆ خدا کے قرب کے معنی ہی کچھ اور ہیں۔ یہ نہیں کہ تم میرے ساتھ رکائی طور پر قریب ہو گئے یا قریب آ بیٹھے تو میرے بدن کے قریب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اس قرب سے پاک ہے۔ کیونکہ وہ جسم اور جسمانییت سے پاک ہے۔ جہت علو اور جہت اسفل، تمام جہات سے پاک ہے تو پھر خدا کے قرب کا کیا مفہوم ہوگا؟ خدا کے قرب کے معنی یہ ہیں کہ جس کو خدا کی بعض معرفت حاصل ہوگی، وہ امتناعی خدا کے قریب ہوگا۔ خدا تو سب کے قریب ہے، مگر خدا کے قریب صرف وہی ہے، جس کو خدا کی معرفت ہے۔ آپ کلمہ پڑھتے ہیں، ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ نے خدا کے معبود اور محمد ﷺ کے رسول ہونے کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کیا ہے۔ یہ آپ کی معرفت ہے اور جو ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ پر یقین رکھتا، اسے خدا کی معرفت نہیں ہے کیونکہ اگر معرفت ہوتی تو وہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ پر یقین رکھتا۔ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ پر یقین رکھنے والے خدا کی معرفت رکھتے ہیں۔ لہذا وہ خدا سے قریب ہیں۔ اب خدا کے قرب کے درجات اور اس کی معرفت کے درجات لامتناہی ہیں۔ نہ اس کے درجات معرفت ختم ہوتے ہیں، نہ اس کے قرب کے درجات ختم ہوتے ہیں۔

☆ جتنے درجات معرفت حاصل ہوتے جائیں گے، اتنے ہی قرب میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

☆ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ درجات معرفت بڑھیں اور ختم ہو، واللہ باللہ ثُمَّ تَالَلَّهِ اللہ والوں کے بغیر تم وہ درجات معرفت طے نہیں کر سکتے۔ اس لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، ”وَدَاعِبًا إِلَى اللَّهِ بِآذِنِهِ وَيَسْرَاجًا مُّشِيرًا“ ہم نے جب ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کہا تو خدا کی توحید اور معبودیت کی تصدیق اور زبان سے اقرار کیا۔ یہ خدا کی معرفت ہے کیونکہ درجات معرفت لامتناہی ہیں۔ لہذا ان لامتناہی درجات معرفت کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں وسیلہ کی ضرورت ہے۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل کو بھیجتا ہے کہ وہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ یعنی توحید و رسالت کی تعلیم دیں اور خدا کی معرفت عطا کریں۔ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کہنے کے لئے نبی کی ذات وسیلہ ہے۔ اس کے بعد معرفت کے درجات اور قرب کے مراتب حاصل کرنے کے لئے بھی وسیلے کی ضرورت ہے۔

☆ اب میں اس حقیقت کو ذرا اور واضح کرتا ہوں کہ اللہ تو ہم سب کے قریب ہے مگر سب اللہ کے قریب نہیں۔ اللہ سے قریب کوئی کوئی ہے اور وہ وہی ہے جس کو اللہ کی معرفت حاصل ہوگی ہے۔ یہاں یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ جب خدا ہر ایک کے قریب ہے تو ہر ایک بھی خدا کے قریب ہے۔

☆ مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ سے ایک تمثیل مختصر بیان کرتا ہوں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جو ہری کے پاس ایک ایسا پیش بہاصل تھا، جس کی قیمت سوائے بہت بڑے بادشاہ کے کوئی اور ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس جو ہری نے سوچا کہ میں اصل کس کے ہاتھ فروخت کروں۔ کوئی اس کی قیمت تو دے نہیں سکتا۔ کیوں نہ میں فلاں ملک کے بادشاہ کے پاس چلا جاؤں اور اسے جا کر اصل پیش کروں اور قیمت وصول کروں۔ چنانچہ وہ اپنا اصل لے کر اس ملک کی طرف روانہ ہو گیا۔ دور دراز کا



سفر تھا اتفاق ایسا ہوا کہ ایک آدمی کو پتا چل گیا کہ یہ جو ہری بیش بہا لعل لیے جا رہا ہے اور یہ کسی بادشاہ کے پاس جا کر اس کی قیمت وصول کرے گا تو کیا اچھا ہو، میں اس کے ساتھ ہولوں۔ اثنائے سفر میں جہاں موقع ملے، میں لعل لے کر چلتا ہوں۔ اس خیال سے وہ جو ہری کے ساتھ ہولیا۔ دوران سفر جب ان کی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا، بھائی، تم بھی مسافر، میں بھی مسافر، کیوں نہ دونوں ایک ساتھ چلیں تو جو ہری نے انکار نہ کیا اور دونوں ایک ساتھ چل پڑے۔ رات کا وقت آیا تو جو ہری نے سوچا، نامعلوم یہ کون ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا لعل لے کر چلتا بنے اس نے عقل سے کام لیا اس نے کہا، بات یہ ہے کہ ہم دونوں مسافر ہیں۔ ایک دو ماہ کا سفر ہے۔ ظاہر ہے کہ جاگتے جاگتے طے نہیں ہو سکتا۔ بشری تھا ضا ہے۔ سونا بھی ہے، آرام بھی کرنا ہے۔ اب اگر ہم دونوں سو جائیں تو دونوں کے لئے خطرہ ہے۔ کوئی تیسرا آدمی دونوں کو ختم کر دے اور ہمارا سامان لے جائے تو دونوں کا نقصان ہوگا۔ اور اگر دونوں جاگتے رہیں تو کب تک جاگتے رہیں گے۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ آدھی رات تم سو جاؤ اور میں جاگتا رہوں اور آدھی رات میں آرام کروں تم جاگتے رہو۔ بات مقول تھی۔ اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ لعل لے کر چلتا ہوں۔ رات ہوئی سونے کا وقت آیا۔ جو ہری نے کہا، آدھی رات تم سو جاؤ، جب وقت ہوگا، میں تمہیں اٹھا دوں گا اور میں سو جاؤں گا۔ جو ہری نے اسے سلا دیا۔ تھکا ماندہ تھا، بے ہوش ہو کر سو گیا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ جو ہری نے سوچا، آدھی رات کے بعد میں نے اسے اٹھانا ہے اور جب میں سو جاؤں گا، اسی طرح بے خبر سوؤں گا تو اس بیش قیمت لعل کا کیا کروں؟ کافی سوچ بچار کے بعد جو ہری نے لعل کو سونے والے کے کپڑوں میں اس طرح چھپا دیا کہ اسے مطلقاً احساس نہ ہوا۔ جب وہ مطمئن ہو گیا کہ اس نے لعل کو کپڑوں کے اندر محفوظ کر دیا ہے۔ آدھی رات گزری جو ہری نے اسے اٹھا دیا۔ بھائی آدھی رات گز گئی۔ اب تم جاگو، میں سوتا ہوں۔ تو خوشی خوشی اٹھ بیٹھا۔ اس نے جو ہری سے کہا کہ ٹھیک ہے، اب تم سو جاؤ۔ جو ہری اطمینان سے سو گیا کیونکہ اس کو لعل کی تو بالکل فکر نہ تھی۔ اب جب یہ سو گیا تو اس کے ساتھی نے اس کی حلائی لینا شروع کر دی۔ اس کی ہر چیز کو ٹٹولا۔ جہاں جہاں ہاتھ مار سکتا تھا، مارے۔ مگر لعل جو ہری کے پاس تھا ہی نہیں۔ ملتا کہاں سے؟ نہ ملا۔ وہ رات گز گئی۔ دن کو یہ بڑا پریشان ہوا۔ مگر پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا، چلو آج نہ کسی کل کسی۔ کل نہ کسی پرسوں کسی۔ لعل تو میں لے لوں گا۔ دن گزر گیا، رات آ گئی۔ جو ہری نے کہا، آدھی رات تم سو جاؤ۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ جو ہری نے گہری نیند دیکھ کر لعل پھر اس کے کپڑوں میں چھپا دیا۔ صبح ہوئی، دوپہر ہوئی قیلو لے کا وقت آیا۔ اس کا ساتھی آرام کر رہا تھا۔ جو ہری نے چپکے سے اپنا لعل نکال لیا اور اس کو اچھا لئے لگا۔ وہ بڑا پریشان ہوا کہ رات کو ڈھونڈتا رہا، مجھے نہیں ملا۔ دوسری رات ہوئی پھر اس نے یہی کام کیا، لعل کو اس کے کپڑوں میں چھپا دیا۔ دوپہر کو قیلو لہ کے وقت وہ آرام کرنے کے لئے سویا تو پھر نکال لیا۔ نہ رکھنے کا اسے پتا چلا، نہ نکالنے کا۔ لیکن روزانہ شام کو جو ہری لعل کو ہاتھوں میں لے کر اچھاتا ہے، ساتھی پریشان ہوتا ہے کہ رات کو میں تلاش کر کر کے مر جاتا ہوں، روزانہ اسی طرح ہوتا رہا، دو مہینے کا سفر تھا، آخر ختم ہو گیا۔ ساتھی بولا، سفر بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ مگر اللہ کے لئے مجھے تو یہ بتا دے کہ لعل تو کہاں رکھتا تھا؟ میں تلاش کر کر کے مر جاتا تھا۔ جو ہری نے جواب دیا، میرا لعل تو تجھ سے قریب ہوتا تھا مگر تو لعل سے دور ہوتا تھا۔ اس نے کہا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ لعل تو مجھ سے قریب ہوتا تھا اور میں لعل سے دور۔ جو ہری نے کہا، لعل میں تیرے کپڑوں میں چھپا دیتا تھا۔ تجھے معرفت ہی نہیں ہوتی تھی تو اپنے سامان میں اپنے کپڑے میں اس کو تلاش نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ لعل تیرے کپڑوں میں ہوتا تھا، تجھے اس کی معرفت نہیں ہوتی تھی، لعل تو تیرے قریب ہوتا تھا، مگر تو لعل سے دور ہوتا تھا۔

☆ مولانا روم اس حکایت کے آخر میں فرماتے ہیں

☆ اولیاء اللہ کا یہی مقام ہے کیونکہ انہیں خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے، وہ کہیں بھی ہوں، کسی صورت میں بھی ہوں، کسی لباس میں بھی ہوں، خدا سے قریب ہوتے ہیں اور جو خدا کے منکرین ہیں، وہ کہیں بھی ہوں، کسی بھی صورت میں ہوں، کسی لباس میں ہوں، خدا تو ان سے بھی قریب ہے، مگر وہ خدا سے دور ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ محمد ﷺ کی ذات پاک کے وسیلہ عظمیٰ کے ہوتے ہوئے آپ اولیاء اللہ کو درمیان میں بحیثیت وسیلہ کیوں لاتے ہیں محمد ﷺ کا وسیلہ عظمیٰ ہی کافی ہے۔

☆ اولیاء اللہ محمد ﷺ اور ہمارے درمیان وسیلہ ہیں اور رسول پاک خدا کے اور ہمارے درمیان وسیلہ ہیں۔ اولیاء کے راستوں پر چل

کر ہم بارگاہ رسالت تک پہنچتے ہیں اور بارگاہ رسالت سے بارگاہ خداوندی تک پہنچتے ہیں۔

☆ سوال وسیلے کے ذریعے آپ کو معرفت خداوندی حاصل ہوگئی یا نہیں۔ اگر معرفت حاصل ہوگئی ہے تو وسیلے کی اب حاجت

نہیں رہی۔ اگر معرفت حاصل نہیں ہوئی تو پھر وسیلہ بے کار ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ وسیلہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جب حصول مقصد ہو گیا، وسیلہ کی حاجت



بھی ختم ہوگی۔ اب اسے ترک کرنا پڑے گا۔ مثلاً ہم گاڑی میں بیٹھ کر ملتان آ گئے۔ ملتان تک ٹرین وسیلہ تھی، اب جب ملتان کا ٹیشن آیا تو ہم نے سوچا، اگر ملتان اتر جائیں تو ہاتھ سے وسیلہ جاتا ہے۔ اگر نہ اتریں تو مقصد ہاتھ سے جاتا ہے۔ اب کیا کریں؟ مقصد کو حاصل کریں یا وسیلہ کو۔ قاعدہ تو یہ ہے، جب مقصد حاصل ہو جائے تو وسیلہ کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ لہذا اگر تمہیں خدا کی معرفت حاصل ہوگئی ہو تو وسیلے کو چھوڑ دو۔ اگر محمد ﷺ کی بارگاہ تک پہنچ گئے تو اولیاء کے وسیلے کو چھوڑ دو۔ اگر بارگاہ خداوندی تک پہنچ گئے ہو تو محمد ﷺ کے وسیلے کو چھوڑ دو۔

☆ میرے دوستو! میں عرض کرتا ہوں، اگر مقصد متناہی ہو تو وسیلہ بھی متناہی ہوتا ہے۔ اگر مقصد غیر متناہی ہو تو وسیلہ بھی غیر متناہی ہوتا ہے۔

☆ آپ نے جو کراچی سے ملتان کی مثال دی، وہ متناہی مقصد کی مثال ہے۔ اگر مقصد غیر متناہی ہو تو وسیلہ بھی غیر متناہی ہوگا۔ ہمارا مقصد خدا کی ذات ہے اور خدا کی ذات لامتناہی ہے۔ اس کی صفات لامتناہی ہیں بلکہ اس کی معرفت کے درجات بھی لامتناہی ہیں۔ تم خدا کی معرفت کے درجات ختم کر دو، میں وسیلے کو چھوڑ دوں گا۔ مزید وضاحت کے لئے عرض کرتا ہوں۔ ہم ہر نماز میں سورہ فاتحہ میں یہ کلمات پڑھتے ہیں

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

☆ یا اللہ! ہمیں سیدھی راہ دکھا۔ صراطِ مستقیم پر چلا۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آج تک آپ کو سیدھی راہ نہیں ملی۔ پھر کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک آدمی موت کے وقت بھی

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

☆ کہہ رہا ہے۔ گویا اب تک اسے سیدھی راہ نہیں ملی۔ کیا آپ اسے مان لیں گے؟ اگر آپ یہ بات تسلیم کر لیں کہ اسے اب تک راہ نہیں ملی۔ اگر نہیں ملی تو بے ایمان مرا۔ اگر اسے راہ مل گئی تو پھر ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ کی دعا کیوں مانگتا جا رہا ہے؟

☆ عزیزانِ گرامی! میں عرض کر دوں، ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ کی دعا سے مراد بھی اس کی معرفت کی راہیں ہیں اور اس کی معرفت کی راہیں کہیں ختم نہیں ہوتیں۔ لہذا ہماری دعا بھی کہیں ختم نہیں ہوتی۔ ہم معرفت کے جس درجے پر پہنچے، اس کے بعد ایک اور درجہ ہے۔ ہم نے کہا، مولا! اپنی معرفت کس درجے پر پہنچنے کی راہ دکھا۔ نہ اس کی منزلیں ختم ہوں گی، نہ اس کی راہیں ختم ہوں گی اور نہ دعائیں ختم ہوں گی۔

”كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ فَبَايَ الْآلَاءِ رَبَّكُمَا فَكَذَّبَا“ (ب: ۲۷، س: الرحمن، آیت: ۲۹)

☆ جسے منزل بھٹتا ہوں، وہ پھر منزل نہیں رہتی۔ حجابِ نور کا یہ سلسلہ یا رب کہاں تک ہے۔

## آؤ رب کی رحمت کی طرف

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا (ب: ۵، س: النساء، آیت: ۶۴)

☆ ترجمہ: اور اگر وہ کبھی اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے تو آ جاتے، تیرے پاس، پھر مغفرت طلب کرتے اللہ سے اور مغفرت طلب کرتا ان کے لئے رسول تو ضرور پاتے، اللہ کو بہت قبول کرنے والا بے حد مہربان۔

☆ یعنی ارشاد ہوتا ہے کہ فاسق و فاجر، گناہ گار و بدکار، اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے، کاش! اے محبوب تیری بارگاہ میں آ جاتے، اپنے کئے پر نادم، اپنی بد اعمالیوں پر شرمندہ اور تیری بارگاہ میں آ کر وہ مجھ سے مغفرت طلب کرتے، اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے۔ اور اے محبوب! اگر تو بھی ان کے لئے ہاتھ اٹھا دیتا، ان کی سفارش کر دیتا، ان کے لئے مغفرت طلب کر لیتا تو وہ گناہ گار مجھے تو بے قبول کرنے والا پاتے، رحم کرنے والا پاتے۔ میں ان کے گناہوں کو بخش دیتا۔ ان کی سزا کو معاف کر دیتا۔ ان کی توبہ قبول کر لیتا۔

☆ یہاں چار باتیں کہی گئی ہیں



☆ خطا کار و گناہ گار حضور کے پاس آئیں۔

☆ اپنے کئے پر نادم ہوں اور خدا سے مغفرت طلب کریں۔

☆ رسول کریم ﷺ بھی ان کے لئے مغفرت طلب فرمائیں۔

☆ پھر وہ اللہ کو ”تَوَّاب“ و ”رَحِيم“ پائیں گے۔

☆ پہلی بات یہ کہی گئی کہ خطا کار و گناہ گار اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے، تمام میرے محبوب ﷺ کے پاس آئیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ مجرم تو

خدا کے ہیں، اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہو کر گناہ گار ہوئے ہیں اور اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ ہر مقام پر ہے اور اس نے اعلان بھی فرمادیا ہے کہ

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْخَرِّ (ب: ۲۶، س: ق، آیت: ۱۶)

☆ ”ہم تو اس کی رگ و جان سے، اس سے زیادہ قریب ہیں۔“ تو اس نے چونکہ نافرمانی خدا کی، کی ہے، اس لئے معافی بھی اس سے مانگی جائے۔ پھر اور کہیں جانے

کی کیا ضرورت ہے؟ اور چونکہ رب ہر جگہ ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے پاس جائیں گے تو اللہ طے گا اور اگر ادھر ادھر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نہیں طے گا۔ جب ایسا ناممکن ہے تو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضری کی شرط کیوں رکھی؟ کہ وہاں جا کر رب تعالیٰ سے استغفار کریں۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا فرمایا ہے کہ اے محبوب ﷺ! جب وہ تیرے پاس آئیں گے تو ”لَوْ جَدُّوا اللَّهَ“ وہ اللہ کو پالیں گے اور کس حال میں

پائیں گے؟ ”تَوَّابًا رَحِيمًا“ تو قبول کرنے والا، بے حد رحم کرنے والا پائیں گے۔ اگر ان خطا کاروں کو میری رحمت سے حصہ چاہیے تو وہ تیری بارگاہ میں آئیں۔ اگر اپنے گناہوں کی بخشش چاہیں تو تیری بارگاہ میں حاضر ہوں ورنہ میں تو ہر جگہ ہوں، لیکن میں صرف ”تَوَّاب“ و ”رَحِيم“ ہی نہیں ”فَقَّاهُ“ و ”جَبَّارُ“ بھی ہوں۔ اگر وہ مجرم تیرا دامن چھوڑ کر آئیں گے تو ضروری نہیں کہ مجھے ”تَوَّاب“ و ”رَحِيم“ پائیں۔ یہ ضمانت ان کے لئے ہے جو تیرا دامن پکڑ کر آئیں گے۔

☆ اور دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ خطا کار خود بھی مغفرت طلب کریں۔ کیونکہ معافی اس کو ملتی ہے، جسے خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہو۔ اپنے جرم کا اعتراف کرے، تبھی معافی کا سوال پیدا ہوگا۔ اور اگر کوئی اپنی غلطی کا اقرار ہی نہیں کرے، یہ تسلیم ہی نہ کرے کہ اس سے گناہ مرزدہوا ہے تو معافی کس بات کی ہوگی؟

☆ اور تیسری بات یہ بتائی کہ رسول اکرم ﷺ بھی اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کی مغفرت طلب فرمائیں۔ وہ اس لئے کہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تو مجرم ہیں اور مجرم کے لئے معافی طلب کرنے پر معافی کا ملنا ضروری نہیں ہوتا۔ وہ اس لئے کہ معافی تو معاف کرنے والے کے کرم پر منحصر ہے۔ معافی مانگنے والے مجرم کا حق نہیں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محبوب! گناہ گاروں کی بخشش کے لئے محض ان کا مغفرت طلب کرنا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے میری رحمت اور میرے کرم کا شامل ہونا بھی ضروری ہے اور اے محبوب! جب میں نے تجھے مجسم رحمت بنا کر بھیجا ہے تو ان کے حق میں تیرا ہاتھ اٹھا دینا میری رحمت کی ضمانت ہے۔ صرف ان کا بخشش طلب کرنا نہیں اس لئے ”وَأَسْتَغْفِرُ لَهُمْ الرَّسُولُ“ فرمایا کہ جب سرکارِ دو عالم ﷺ رحمت مجسم ہوئے، مغفرت فرمائیں گے، تب وہ گناہ گار معافی کے مستحق قرار پائیں گے اور اس طرح وہ اپنے رب کو تَوَّاب اور رَحِيم پائیں گے۔

## ایک اعتراض کا جواب

☆ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت تو صرف سرکارِ دو عالم ﷺ کے زمانے کے لئے تھی۔ جب سرکارِ دو عالم زمین پر لوگوں کے سامنے موجود تھے اور لوگ وہاں پہنچ سکتے تھے۔ اب جب سرکارِ پروردگار چلے ہیں تو اب سرکار کی بارگاہ میں حاضری کیوں کر ممکن ہے؟ اور یہ بھی کہ اگر آج بھی سرکار اپنے مزارِ اقدس میں جلوہ فگن ہیں تب بھی مدینہ جا کر حاضری تو ہر ایک کے لئے ممکن نہیں تو وہ گناہ گار جو استطاعت نہیں رکھتے، وہ اپنی بخشش کیسے کروائیں؟

☆ جواباً عرض ہے کہ حضور ﷺ جس وقت ظاہری حیات کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس زمانے میں بھی اسلام مشرق و مغرب میں

پھیل چکا تھا۔ دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے، مسلمان ہو چکے تھے۔ اس وقت بھی تمام مسلمان سرکار کی بارگاہ میں حاضر نہ ہو

سکتے تھے۔ سفر کی دشواریاں اور فاصلوں کی طوالت پھر وسائل کی کمی وغیرہ ایسے اسباب تھے کہ تمام مسلمان اس وقت بھی حاضری کی

سعادت سے بہرہ مند نہ ہو پاتے تھے۔ بعض اوقات کچھ مزید مجبوریوں بھی دامن گیر ہوتی تھیں۔ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی مثال سامنے رکھیے جو یمن میں رہتے



تھے اور جن کے حوالے سے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یمن سے محبت کی بو آتی ہے لیکن اس محبت اور تعلق کے باوجود وہ سرکار کی بارگاہ میں حاضر نہ ہو پائے۔ اسی طرح ہزاروں مسلمان اس زمانے میں بھی بارگاہ رسالت میں حاضری سے قاصر رہے تو کیا یہ آیت کریمہ ان کے لئے نہ تھی؟ اور یہ کہنا کہ یہ آیت اس زمانے کے ان مسلمانوں کے لئے تھی جو بارگاہ رسالت میں پہنچ سکتے تھے، قطعاً قائل قبول نہیں ہو سکتا۔

☆ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے ہے اور واقعی دنیا تک یہ قائل عمل رہے گا۔ منبع رشد و ہدایت اور خزینہ علم و حکمت رہے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن کا کچھ حصہ تو قائل عمل ہو اور کچھ اب عمل کے قائل نہ رہا ہو۔ جیسا کہ قرآن مجید نے خود وضاحت کی

قَبْرُكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (س: الفرقان، آیت: ۱)

ترجمہ ☆ بڑی برکت والا ہے وہ جس نے فیصلہ کرنے والی کتاب اپنے (مقدس) بندے پر اتاری تاکہ وہ تمام جہانوں کو ڈرانے والا ہو۔ اور مزید فرمایا

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ (س: البقرة، آیت: ۱۸۵)

ترجمہ ☆ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، لوگوں کو ہدایت کرنے والا۔

☆ ”الناس“ قیامت تک آنے والے تمام انسان شامل ہیں لہذا قرآن کی آیت ”وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ“ بھی سرکارِ دو عالم ﷺ کے زمانے تک محدود نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے ہے۔

☆ رہی یہ بات کہ اھر تو حکم ہے کہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے محبوب ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں اور اھر ہر شخص کے لئے تو سرکار کی بارگاہ میں حاضری ممکن نہیں ہے تو بات کیسے بنے گی؟ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟

☆ تو اس کا حل یہ ہے کہ حضور ﷺ حیات ظاہری میں بھی اللہ کے رسول تھے اور اب بھی اللہ کے رسول ہیں۔ اس لئے تمام مسلمان جب کلمہ پڑھتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ، اللہ کے رسول ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ سرکار اللہ کے رسول تھے۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم ﷺ جس طرح اپنی حیات ظاہری میں مسند رسالت پر جلوہ گن تھے، اسی طرح آج بھی ہیں اور ہر منصب و عہدہ کی نہ کی شان، اختیار یا اتھارٹی (Authority) سے مشروط ہوتا ہے، چونکہ سرکار آج بھی منصب رسالت کے حامل ہیں، اس لئے اس منصب کی رعایت سے سرکار کو جو شان، جو مقام اور جو اختیار ملا تھا، وہ بھی یقیناً باقی ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ اپنے مناسبات اور لوازمات کیساتھ ثابت ہوتی ہے۔ جب رسالت و نبوت ثابت ہے تو اسکے لوازمات اور مناسبات بھی یقیناً ثابت ہیں اور چونکہ آیت کریمہ میں بارگاہ رسالت کی حاضری کا حکم ہے اور رسالت جاری و ساری ہے اس لئے یہ حکم آج بھی نافذ العمل ہے۔

☆ اب رہا یہ مسئلہ کہ خدا تو ہر جگہ ہے، اس سے مغفرت کہیں بھی طلب کی جاسکتی ہے لیکن بارگاہ رسالت میں حاضری کیلئے تو زادِ راہ، وقت، مصروفیات سے چھٹکارا اور ذمہ داریوں سے مہلت درکار ہے اور ساتھ ہی جسمانی صحت بھی ضروری ہے تو ہر شخص اس بار کو کیسے اٹھا سکتا ہے؟ تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس مشکل کو اس طرح حل فرمایا کہ ”اَللّٰہِیْ لَوْ لٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنفُسِهِمْ“ ”یہ نبی ایمان والوں کیساتھ انکی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔“ یعنی اسے ایمان والو! یہ تو دوزخ کرو کہ اب اس بارگاہ میں حاضری کیسے ہوگی؟ حالات سازگار نہیں، زادِ راہ پاس نہیں، مصروفیات اجازت نہیں دیتیں، صحت اس قائل نہیں، یہ مت سوچو، یہ فکر نہ کرو۔ وہ اس لئے کہ اپنے نبی مہترم کو تمہاری جانوں سے بھی زیادہ تم سے قریب کر دیا ہے۔ تر دو اور فکر تو اس وقت ہو، جب دوری ہو، جب فاصلہ ہو، تمہاری جانوں اور تمہارے درمیان فاصلہ ممکن ہے لیکن اگر تم صاحب ایمان ہو تو نبی مہترم سے دور نہیں ہو سکتے۔ وہاں فاصلے اور مسافت کا کوئی تصور نہیں۔

☆ اس لئے جہاں ہو، جس حال میں ہو، اگر تم سے گناہ مرزد ہو جائے، اگر تمہارا ضائع بشریت غلطی کا ارتکاب کر بیٹھو تو اپنے کئے پر تادم ہو جاؤ۔ میرے محبوب کا تصور کرو جو تمہاری جانوں سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی بارگاہ کا تصور باندھ کر مجھ سے استغفار کرو اور اگر تم

نے ایسا صدق دل سے کیا، تمہاری نیت درست ہوئی، تم واقعی اپنے کیے پر شرمندہ ہوئے تو میرا محبوب کریم ہے، تمہارے لئے ”رُؤُوفٌ

وَرَحِیْمٌ“ ہے۔ وہ تمہارے حال پر ضرور کرم فرمائے گا اور تمہارے لئے مغفرت طلب کرے گا۔ اس طرح تم میری مغفرت اور بخشش

کے حق دار ہو جاؤ گے۔ جیسے ہی تم نے اپنی توجہ کبیرے محبوب کی بارگاہ میں حاضر کیا اور میرے محبوب نے تمہارے حال پر التفات کیا، تم فوراً مجھے ”رُؤُوفٌ وَرَحِیْمٌ“ پاؤ



WWW.KAZIMIS.COM

WWW.KAZIMIS.COM

## اِيتُونِي بِقُرْطَاسٍ

☆ غزالی زماں رضی اللہ عنہ کی ایک تقریر کے دوران ایک معترض نے تحریراً سوال کیا، آپ نے نمازِ ظہر کے بعد کی نشست میں خطاب کرتے ہوئے

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝

☆ آیہ کریمہ پڑھی تھی اور اس کی روشنی میں یہ کہا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر قول ”وحی الہی“ ہے۔ اگر یہ بات اسی طرح درست ہے تو حضور ﷺ کے ہر امر کی تعمیل لازمی قرار پائی جبکہ حدیثِ قرطاس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس موقع پر سرکار کے فرمان کی تعمیل نہیں کی گئی بلکہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا

حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ

☆ آپ مہربانی فرما کر اس آیت کریمہ کی روشنی میں اس حدیث کی وضاحت کریں۔

☆ امام اہلسنت نے اس سوال کا جو جواب عطا فرمایا، وہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

☆ جواب حضور ﷺ نے جو فرمایا کہ مجھے کاغذ دو میں تمہیں ایک ایسی چیز لکھ کر دوں جو تمہیں گمراہی سے بچائے گی۔ یہ فرمان کسی خاص شخص سے نہیں تھا۔ بلکہ اس وقت جو لوگ بھی جتنے صحابی اور اہل بیت سے جتنے مقدس نفوس وہاں تھے، ان سب سے خطاب تھا۔ حضور ﷺ پر اس وقت بتقاضائے بشریت بیماری کا غلبہ تھا۔ حضرت عمر نے سرکاری تکلیف کا خیال کرتے ہوئے عرض کی



☆ اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب (قرآن مجید) موجود ہے۔ ”وہو حسبنا“ اور وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ یہ گزارش حضور ﷺ کی نافرمانی نہ تھی بلکہ کسی خاص شخص کو مخاطب کئے بغیر یہ فرمان دراصل مخاطبین کا امتحان تھا۔ حضور ﷺ چونکہ چشم عالم سے روپوش ہونے والے تھے اور سفر آخرت پر روانہ ہونے کو تھے۔ اسلئے یہ اطمینان ضروری تھا کہ وہ حضرات صحابہ کرام جو ہر مشکل کے حل کیلئے سرکار ﷺ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ سرکار کے پردہ فرمانے کے بعد اپنے مسائل کے حل اور مشکلات کی آسانی کے لئے الہامی تعلیمات اور فرامین نبوی کی روشنی میں امت مسلمہ کی رہنمائی کر سکیں گے۔ حضور ﷺ کے فیض صحبت سے ان میں یہ استعداد اور صلاحیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں کہ وہ قرآن مجید اور سنت رسول سے تمام پیش آنے والے مسائل حل کر سکیں۔ اس وقت آپ کے پاس موجود افراد میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو آپ کی نیابت کرنے والے اور مسند خلافت پر جلوہ گن ہونے والے تھے۔ آپ کی صحبت کے انوار اور نور نبوت کی روشنی نے ان کے سینوں کو چمکا دیا تھا۔ اگر آپ کی نیابت کرنے والے اس اہل نہ ہوتے کہ آئندہ پیش آنے والے جملہ معاملات و مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں حل کر سکیں تو اس کا مطلب تو معاذ اللہ یہ ہوگا کہ آپ دین کو ختم کئے جارہے تھے۔ چنانچہ اس کی وضاحت کے لئے آپ نے خدا کے فرمان کے مطابق کہا کہ کاغذ لاؤ میں تمہیں ایسا نوشتہ دوں جو تمہیں گمراہی سے بچائے گا تا کہ آپ کے اس فرمان کے جواب میں آپ کے صحابہوں میں سے کوئی بول اٹھے اور عرض کرے کہ سرکار! آپ ہم سے اس عالم میں رخصت نہیں ہو رہے جب ہمیں اپنی آئندہ زندگی اور بنی نوع آدم کی فلاح کے لئے کسی مزید حکم کی ضرورت ہو بلکہ آپ نے ہم میں وہ نور بصیرت پیدا فرمادیا ہے کہ اللہ کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔ مقصد وحی اور منشاء نبوت حضرت عمر کے ”حبس کتاب اللہ“ کہنے سے پورا ہو گیا۔ وگرنہ حضرت عمر کی اس گزارش کے بعد سرکار مزید اصرار فرماتے اور ان کو جھڑک دیتے کہ میں تم سے کاغذ مانگ رہا ہوں اور تم میرے حکم کی تعمیل کی بجائے اپنے لیاقت و قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو۔ میں نبی ہوں، وحی مجھ پر نازل ہوئی ہے جو کچھ میں تمہیں بتانے والا ہوں، وہ تم از خود کیسے جان سکتے ہو؟ اور پھر اس مقام پر سیدنا صدیق اکبر، سیدنا عثمان غنی اور مولائے کائنات سیدنا علی المرتضیٰ کا حضرت عمر کی بات کے جواب میں سکوت اختیار کرنا اور حکمران نہ کرنا اس بات کو مزید تقویت پہنچاتا ہے کہ یہ عالی مرتبت ہستیاں بھی منشاء رسالت کو پا چکی تھیں اور گویا حضرت عمر نے ان سب کی ترجمانی کی تھی کیونکہ سرکار کا فرمان ہے

ان الحق ينطق على لسان عمر

☆ اگرچہ چند صحابہ نے حضرت عمر سے اختلاف ضرور کیا لیکن وہ عظمت و شان کے حامل ہونے کے باوجود اس مقام پر نہ پہنچے تھے جو ان اکابر صحابہ کرام کا مقام تھا۔ اسلئے ان کا اختلاف دراصل مشورے پر مبنی سمجھا جائے گا اور اکابر صحابہ کا سکوت حضرت عمر کے قول کی تصدیق معصور ہوگا اور نہ خود سرکار نے انہیں سرزنش فرمائی۔ اس لئے بعض صحابہ کے اختلاف کا وہ مفہوم نہیں ہوگا جو معترض نے سمجھا ہے۔

☆ معترض خواہ حضور ﷺ کے ہر فرمان کو وحی سمجھے یا نہ سمجھے اس بات کا قائل تو ضرور ہوگا کہ حضور ﷺ جب دینی امور کی تشریح و تفسیر سے آگاہ فرماتے تھے اور دین سے متعلق احکامات کی تبلیغ فرماتے تھے تو وہ فرمودات تو یقیناً وحی الہی کے تابع ہوتے تھے۔ اب یہ سوچئے کہ یہ معاملہ دین سے متعلق تھا یا نہیں؟ خلافت و گمراہی سے بچنا اور صراطِ مستقیم کو اختیار کرنا تو دین کا مقصود و مدعا ہے۔ اس لئے یہ فرمان یقیناً وحی الہی ہوگا کہ یہ ”من حیث الرسول“ ارشاد ہے۔ اب اگر یہ تشریح جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے، تسلیم نہ کی جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ ایک ایسی تحریر جو دین سے متعلق تھی اور حکم خداوندی سرکار ﷺ و تحریر عطا فرمانے والے تھے، حضرت عمر کے کہنے پر سرکار ﷺ نے عطا نہ فرمائی تو اس کا مفہوم تو یہ ہوگا کہ معاذ اللہ حضور ﷺ خود بھی امر الہی کی تکمیل سے پہلو تہی کے مرتکب ہوئے اور ایسا ممکن نہیں ہے، وہ اس لئے کہ قرآن نے کہا،

”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ“ (س مائدہ آیت ۶۷)

☆ ترجمہ: اے رسول، پہنچا دیجئے جو انا را گیا آپ پر آپ کے رب کی طرف سے اور اگر آپ نے (ایسا) نہ کیا تو اپنے رب کا

پیغام آپ نے نہ پہنچایا۔“

☆ گویا اتنا پڑے گا کہ دین کے مسائل، گمراہی سے بچنے اور صراطِ مستقیم اختیار کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی، وہ آپ



نے اپنی امت تک یقیناً پہنچائی اور اس حدیث مبارکہ میں حضرت عمر کے عرض گزار ہونے کے بعد آپ نے کوئی شے تحریر نہ فرمائی۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر کے قول سے آپ کے فرمان کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

☆ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ وہ وقت ایسا تھا جب تعلیم عام نہ تھی۔ ہر شخص پڑھنا لکھنا نہ جانتا تھا اور کاغذ قلم بھی عام نہ تھے اور ہر شخص کے پاس نہ ہوتے تھے اور یہ بات بھی تمام اہل علم جانتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ الزہرا کا حجرہ مسجد نبوی سے متصل تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شمار کاتبین وحی میں سے تھا، اس لئے جب سرکار ﷺ نے کاغذ مانگا تو سب سے پہلے حضرت علی کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ اپنے گھر سے جو سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ کے حجرے سے بہت قریب تھا، فوراً کاغذ قلم لا کر سرکار ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ ان کا ایسا نہ کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بھی حضرت عمر کی بات سے متفق تھے۔

☆ اس مضمون میں نہایت قابل ذکر بات یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز جس کے باعث امت مسلمہ گمراہی سے بچتی اور ہمیشہ صراطِ مستقیم پر رہتی اور جو ہماری ہدایت کے لئے بے حد ضروری تھی۔ اگر ہم تک نہیں پہنچی تو یقیناً دین نامکمل رہ گیا کیونکہ وہ بات تو ہمیں معلوم ہی نہیں جو سرکار ﷺ تحریر فرمانا چاہتے تھے اور وہ گمراہی سے بچنے میں ہماری راہنمائی بت ہوتی لیکن قرآن مجید اعلان کر رہا ہے کہ ”اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَانْتَمَتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي“ دین تو مکمل ہو گیا اور اس کی وضاحت حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کر رہے ہیں کہ سرکار ﷺ کے رب نے دین کی تکمیل کر دی ہے اور آپ کی زبان اقدس سے ہمیں یہ بشارت سنائی جا چکی ہے اور آپ نے ہماری تربیت فرمائی ہے۔ اس لئے سرکار آپ کے فرمان کے مقصد کی تکمیل کرتے ہوئے میں عرض کرنا ہوں کہ آپ کی نظر اور صحبت کی برکت سے آپ کے غلام اس قابل ہو چکے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں صراطِ مستقیم تلاش کر سکیں اور گمراہی سے محفوظ رہ سکیں۔

WWW.KAZIMIS.COM

تفسیر کلمہ طیبہ و شہادت



☆ محترم حضرات! آج میں خطِ کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کی صحیح تفسیر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر انسان کو اس کے حق سے مستفیض فرمائے۔ (آمین، ثم آمین)

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ

☆ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں

☆ اور کلمہ شہادت

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

☆ میں سچے دل سے گواہی دیتا ہوں کہ اللہ رب العزت کے بغیر کوئی معبود برحق نہیں اور میں سچے دل سے گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے عبد مقدس اور رسول ہیں۔

سوال ☆ ”اَشْهَدُ“ کا لفظ ضروری ہے کہ نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کلمہ طیبہ میں کیوں نہیں اور اگر ضروری نہیں تو کلمہ شہادت کا کیوں ہے؟

جواب ☆ شہادت میں مشاہد (گواہ) اور شہادت (گواہی) اور مشہود (جس کے لئے گواہی دی گئی) کا ہونا ضروری ہے کیونکہ شہادت ان کے بغیر متصور نہیں۔ مشاہد اور شہید گواہی دینے والے کو کہتے ہیں اور جس امر کی گواہی دی گئی اسے شہادت کہتے ہیں۔ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ میں مشہودہ کا بیان ہے اور ”اَشْهَدُ“ میں مشاہد اور شہادت کا بیان ہے۔ مشہودہ پہلے ہوگا اور شہادت بعد کو ہوگی۔ جیسے میں کسی کے حق میں جا کر کوئی دوں تو میں گواہ ٹھہروں گا اور میرے بیانات، شہادت اور جس کے حق میں گواہی دی گئی، وہ مشہودہ ہوگا۔ وہ پہلے ہوگا تو میں اس کے لئے گواہی دوں گا۔ اگر وہ پہلے نہ ہوگا تو کوئی کس کی دوں گا۔ مشہودہ ملزم ہے اور شہادت اسے لازم ہے اور جملہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ میں مشہودہ کا بیان ہے اور ”اَشْهَدُ“ میں مشاہد اور شہادت کا۔ ”الشهادة والشهود“ دونوں مصدر ہیں بمعنی ”الحضور مع المشاهدة اما بالبصيرة وبالبرصيرة“ شہود فقط حضور کو نہیں کہتے بلکہ شہود وہ ہے جہاں حضور ﷺ کیساتھ مشاہدہ بھی ہو۔ مثلاً ایک آدمی نیند میں تھا اس کو اٹھا کے یہاں لے آئے اور اسے نیند کی حالت میں واپس بھی لے گئے تو اس کو شہود نہیں کہیں گے۔ کیونکہ یہاں مشاہدہ نہیں ہے۔

سوال ☆ آپ کہیں گے کہ یہ معنی ”اَشْهَدُ“ میں تحقق نہیں۔ کیونکہ باری تعالیٰ کا بصر اور بصیرت سے مشاہدہ نہیں کیا جاتا۔

جواب: یہاں ملزم ہول کر لازم ہوا دیا گیا ہے یعنی مشاہدہ بالبصر کہ معنی علم لازم ہے۔ جیسے میں نے یہاں آ کر تمہیں مشاہدہ کیا تو تمہارا علم مجھے یقینی ہو گیا تو معنی یہ ہوگا کہ میں علم یقینی سے کہتا ہوں کہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ مگر فقط علم یقینی کافی نہیں۔ جب تک اس علم یقینی کو ”اَشْهَدُ“ سے تعبیر نہ کیا جائے۔ کیونکہ علم یقینی کبھی مجاز میں مستعمل ہوتا ہے مگر ”اَشْهَدُ“ مجاز کے شبہ سے پاک ہے۔ لفظ ”محمد“ پر بحث کے لئے جی چاہتا ہے مگر اس کے لئے کافی وقت چاہیے۔ اب بر دست عبد کے معنی میں کچھ بحث کرنا چاہتا ہوں۔

## عبد کی قسمیں

☆ عبد تین قسموں میں ہے (۱) عبد مملوک (۲) عبد آبق (۳) عبد ماذون

(۱) عبد مملوک: عبد مملوک جسے عبد رقتی کہتے ہیں یعنی جس کو مولا کی طرف سے کوئی اختیار نہ ہو اور وہ ہر جہت میں مولا کے ملک میں ہو۔

(۲) عبد آبق: عبد آبق وہ ہے جو باغی ہو کر مولا سے بھاگ گیا ہو، اگر چہ وہ اپنے گمان میں بھی بھاگا ہوا ہو۔

(۳) عبد ماذون: وہ ہے کہ جس کی استعداد کو دیکھ کر مولا ہر جائز اور ممکن امر میں اختیار دے دے۔ اب اس عبد ماذون کا قول و فعل، مولا

کا قول و فعل ٹھہرتا ہے۔ ہم عوام عبد مملوک ہیں اور کفار عبد آبق۔ جب عبد آبق کی نسبت اللہ کی طرف ہوتا ہے خیال میں آبق ہوگا۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ملک اور قبضہ سے نکلنے کا تصور بھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے گمان میں بھاگے ہوئے ہیں اور نبی پاک صاحب لولاک

عبد ماذون ہیں کیونکہ آپ کا ہر قول و فعل ”من حيث النبوة“ اللہ تعالیٰ کا قول و فعل ٹھہرے گا۔ چنانچہ ”وَمَا رَمَيْتْ إِذْ رَمَيْتْ وَلَكِنَّ



اللَّهُ رَضِيَ اور اِنَّ الَّذِيْنَ يَبْعُوْنَكَ اِنَّمَا يَبْعُوْنَ اللَّهَ اور وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ "پر متر ارض حقیقاً خدا تعالیٰ پر متر ارض ہوگا۔ ہمارے اس بیان کی طرف "اَلَا مَنْ اِذْنُ لَكَ الرَّحْمَنُ" کا اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو اذن دے، وہ اللہ کی بارگاہ میں عرض کر سکتے ہیں۔

### شبہ

☆ آپ کہیں گے کہ یہ شفاعت کا بیان ہے۔

### شبہ کا ازالہ

☆ تو میں جواباً عرض کروں گا کہ آیت "اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكُوْثَرَ" کو ذرا غور سے پڑھیں کہ کثر سے کیا مراد ہے۔ تفسیر ابن جریر میں ہے کہ امام مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، "اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكُوْثَرَ۔ الْخَيْرَ الْكَثِيرَ الْخَيْرَ كُلَّهُ، خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ" اور کسی نے کہا کہ کثر سے مراد کثر ہے تو آپ نے جواب دیا، "هُوَ اَيْضًا مِنَ الْخَيْرِ الْكَثِيرِ" وہ بھی تو خیر کثیر میں شامل ہے اور یہ حضرت مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں بلکہ ان کا قول اگر آپ کے اور شاگردوں کے مقابل آئے تو محدثین ان کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

### شبہ

☆ آپ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

قُلْ لَا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا (پ: ۹، س: الاعراف، آیت: ۱۸۸)

☆ "آپ فرمادیتے ہیں، میں خود اپنے نفع اور نقصان کا بھی مالک نہیں ہوں۔"

### شبہ کا ازالہ

☆ ذرا اس آیت مبارکہ کو آگے بھی پڑھیں کیونکہ تمام قرآن پر ہمارا ایمان ہے۔ فقط آدمی آیت پر ایمان معتبر نہیں، اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "اَلَا مَا خَافَ اللَّهُ" الا سے قل جس کی نفی ہوتی ہے اسی کا "الا" کے بعد اثبات بھی ہوتا ہے۔ جیسے کلمہ طیبہ "لَا اِلَهَ اِلَّا اللَّهُ" میں ہے تو اب آیت کا معنی یہ ہوگا کہ میرا نفع و نقصان کا مالک ہونا، اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اذن سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اذن کے بغیر میں مالک نہیں ہوں۔

### شبہ

☆ آپ کہیں گے کہ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

قُلْ لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبِ (س انعام آیت ۵۰)

### شبہ کا ازالہ

☆ آپ نے بھی سوچا کہ "لَكُمْ" کا مخاطب کون ہیں؟ "لَكُمْ" کے مخاطب کفار اور منافقین ہیں، مومنین نہیں ہیں۔ یعنی اے محبوب! آپ کفار سے کہہ دیں کہ میرے پاس خزانے نہیں ہیں کیونکہ کفار اس بات کے امل نہیں ہیں کہ انہیں اسرار کی بات بتائی جائے۔ اگر یہ مخاطب مومنین کے لئے ہوتا تو آقا ﷺ نے اس کے برعکس کیونکر فرمایا، صحیح بخاری میں ہے کہ آقا ﷺ نے فرمایا، "اَعْطِيتُ مَفَاحِجَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ" کیا آقا ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو قرآن کے خلاف فرمایا؟ جب کفار سامنے آئے "لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَائِنُ اللَّهِ" اور جب مومن سامنے آئے تو فرمایا، "اَعْطِيتُ مَفَاحِجَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ" معلوم ہوا، اس آیت کے مخاطب کفار اور منافقین ہیں اور جملہ "وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبِ" کا عطف عِنْدِيْ خَزَائِنُ اللَّهِ پر ہے اور "لَكُمْ" مراد لگے گا تو معنی یہ ہوگا کہ "اے کفار! میں تجھے نہیں کہتا کہ غیب جانتا ہوں" اور مومنین کو فرمایا، صحیح بخاری میں ہے یعنی میں تمام چیزیں اسی مقام پر ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہوں، کوئی چیز مخفی نہیں رہی اور "لا" زائد ہے تاکہ اے کفار! لایا گیا ہے۔ کیونکہ جب پہلے "لَا اَقُوْلُ" لایا گیا تو اب "اَعْلَمُ الْغَيْبِ" کہنا چاہئے تھا۔ عبارت یوں ہوتی "لَا اَقُوْلُ لَكُمْ اَعْلَمُ الْغَيْبِ" اب عبارت ہے کہ "لَا اَقُوْلُ لَكُمْ لَا اَعْلَمُ الْغَيْبِ" تو یہ معنی نہیں بنتا اس لئے ابن جریر نے کہا کہ یہ لفظ "لا" تاکید کے لئے زائد ہے اور "وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلِكٌ" کا عطف اسی جملہ پر ہے اور اس کا معنی ابن جریر نے یوں کیا کہ میں، تجھے یہ نہیں کہتا کہ میں فقط "ملک" ہوں بلکہ "ملک" سے کئی درجہ آگے چلا گیا ہوں، جیسے معراج کی رات والی ہیر



اس امر پر شاہد ہے۔

## شبہ

☆ ”اعطيت مفايح خزائن الارض“ سے معلوم ہوتا ہے کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام فقط زمین کے خزان کی چابیاں دیئے گئے ہیں۔ آسمان کے خزان کے مالک نہیں ہیں۔

## شبہ کا ازالہ

☆ منہد امام احمد میں آیا ہے کہ آقا علیہ السلام جب معراج پر تشریف لے جا رہے تھے حضرت جبریل علیہ السلام حاضر بارگاہ ہوئے اور ہنر کھرا میں موتیوں کی لڑی پیش کی اور عرض کیا کہ زمین کے خزان کی چابیاں تو آپ زمین پر دیئے گئے اور آسمان کے خزان کی چابیاں یہ لے لو۔ پتہ چلا کہ تمام خزان کی چابیاں آقا ﷺ دیئے گئے ہیں۔

## عبد کا مفہوم

☆ عبد کا معنی ہے پامل ہونا، اس لئے عربی میں اس راستہ کو کہ جس پر لوگ چلیں اور وہ پامل ہو چکا ہو، معبد کہتے ہیں۔ معبد کو عبد اس لئے بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اپنے بلکہ اپنے آپ کو معدوم پائے اور یہ کمال عبدیت ہے جو خواص کو حاصل ہے۔ خاص کرنی پاک صاحب لولاک ﷺ کو جو عبد خاص ہیں، وہ کسی نئی کو بھی حاصل نہیں۔ آقا علیہ السلام جب اللہ کی بارگاہ میں جائیں تو عبدیت و خائیت ہے کہ اس سے فیض لینا ہوتا ہے اور جب کائنات کو فیض دیں تو یہ رسالت ہے۔ لینا پہلے ہوتا ہے اور دینا بعد کو اسی لئے کلمہ شہادت میں عبدیت کا بیان پہلے اور رسالت کا بعد میں۔ آج لوگوں نے عبدیت کے مقام کو نہیں سمجھا۔ اللہ ﷻ عبد کو دیکھ کر دھوکہ میں آ گئے اور اپنی مثل سمجھنے لگ گئے حالانکہ عبدیت ایک کرامت ہے۔ جب بندہ کو کمال عبدیت حاصل ہوتی ہے تو پھر بولنا اس کا، اس کا بولنا نہیں ہوتا اور سننا اس کا، اس کا سننا نہیں ہوتا۔ دیکھنا اس کا، اس کا دیکھنا نہیں ہوتا۔ بس وہ ذات حق میں فنا ہوتا ہے اور اسی ہی کے حسن کے جلوے اس سے ظاہر ہو رہے ہوتے ہیں۔

## باذن اللہ اور من دون اللہ کی وضاحت

☆ یہاں ایک بات ضروری ہے، وہ یہ کہ جہاں ”اذن“ ہو وہاں ”من دون اللہ“ کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ”من دون اللہ“ تو کوئی پتا بھی نہیں ہلا سکتا۔ کوئی کبھی کا پر بھی نہیں بنا سکتا۔ محض کا پر بھی نہیں ہلا سکتا اور ”باذن اللہ“ ہو تو مردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں واضح طور پر فرمایا، ”وَأَنبِئْهُنَّ الْأَكْثَمَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ“ ہم ”من دون اللہ“ کو مانتے ہیں ہم ”باذن اللہ“ کو ماننا تو قرآن نے ”من دون اللہ“ کی نفی کی اور ”باذن اللہ“ کا اثبات فرمایا، ہمارے دونوں قسموں کی آیات پر ایمان ہے۔ کیونکہ ہم حج آیات قرآنی کو مانتے ہیں۔ ”فَلَا مَن دُونَ اللَّهِ“ والی آیات پڑھ کر ”باذن اللہ“ کی نفی کر دینا، عظیم جہالت اور وادی ضلالت میں جانا ہے۔ اللہ جل مجدہ کے اذن سے اللہ والے سب کچھ کر سکتے ہیں مگر حقیقت میں ان کا کرنا، ان کا کرنا نہیں، خود ذات حق کا فعل ہے جیسے ملائکہ کا فعل، اللہ جل مجدہ کا فعل قرار پاتا ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے افعال بھی اللہ رب العزت کے افعال قرار پاتے ہیں۔

## شبہ

☆ جب ہر چیز آقا ﷺ کے دامن میں ہے اور وہ آقا کے ملک میں ہے تو وہ خدا کے ملک سے نکل گئی۔ لہذا اللہ تعالیٰ کسی چیز کا مالک نہ رہا۔

## شبہ کا ازالہ

☆ پہلے بتاؤ کہ جو چیزیں تمہارے قبضہ و ملک میں ہیں، کیا یہ خدا کے ملک سے نکل گئی ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں ”لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ تو حیرت ہے کہ تمہارے ملک میں آ کر اللہ تعالیٰ کے ملک سے یہ چیزیں نہیں نکلیں تو نئی پاک ﷺ کے ملک میں آ کر خدا کے ملک سے کیوں کر نکل جائیں گی؟

## اسلامی معاشرے میں طلباء کا کردار

☆ امام اہلسنت، غزالی دور اس حضرت علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی کی وہ تقریر جامع جوانہوں نے انجمن طلباء اسلام کے



نَسْتَعِذُّ وَنُتَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ اِنَّا بِغَفِّ

قَاعُوْذٍ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

☆ عزیز طلباء! یہاں حاضر ہو کر اور آپ حضرات کا یہ اجتماع دیکھ کر میں اس قدر مسرور ہوں کہ میں اپنے ان جذباتِ مسرت کو ظاہر کرنے کے لئے نہ الفاظ پاتا ہوں، نہ اس کے لئے وقت کی گنجائش محسوس کرتا ہوں۔ میں رکی گھنگو کا عادی نہیں اور اس کیلئے وقت بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ اجتماع اگرچہ بہت بڑا نہیں لیکن بڑے بڑے اجتماعات کے مقابلے میں آپ کا یہ اجتماع میرے لئے انتہائی مسرت کا باعث ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ حضرات قوم کی ساری عزتیں ہیں۔ قوم کی نشو و نما، قوم کی فلاح، قوم کی اصلاح، قوم کی بقا، یہ آپ حضرات کے دامنوں سے وابستہ ہے۔ معاشرے میں طلباء کا کیا کردار ہے؟ اور انہیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟ یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے۔ اس کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

☆ آپ کو معلوم ہے کہ حیاتِ انسانی کے دو ستون ہیں۔ ایک علم، دوسرا عمل۔ علم بنیاد ہے اور عمل اس بنیاد کی تعمیر۔ علم ایک درخت ہے اور عمل اس درخت کے پھول ہیں۔ حضورِ جبارِ مدنی جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے دینِ متین کا جو نقشہ پیش فرمایا ہے، اس میں جو نہیں ہے۔ اسکے اندر استنباط کیلئے، سوچنے کے لئے اور صحیح لائنوں پر غور و فکر کیلئے بڑی وحشیں ہیں مگر افسوس کہ ہماری اپنی تنگ نظری نے ان وسعتوں کو محدود کر دیا۔ ہم یہ سمجھ کر حقائق کا تنازع پر غور کرنا اور حقائق کے علم کا حصول بے کاری بات ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے جس ذرہ کا آپ علم حاصل کریں گے، وہ آپ کے حق میں نور ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ علم کا مقصد کیا ہے؟ علم کیے معنی میں جاتا۔ کس چیز کا جانا؟ جو چیز ہے، اس کو جانا لیکن نہ ہونے والی چیز کو ہم جانیں کہ وہ ہے تو یہ علم نہ ہوگا، جہل ہوگا۔ مثلاً اب رات نہیں ہے اور اگر کوئی شخص جانے کہ یہ رات ہے تو یہ جانا کہاں ہے؟ یہ تو نہ جاتا ہے۔ جو چیز ہے نہیں، اس کو ہم جانیں کہ ہے اور جو چیز ہے، اس کو ہم جانیں کہ نہیں ہے، یقین کیجئے کہ ہست کو نیست جانا اور نیست کو ہست جانا، یہ دونوں جہل ہیں۔ علم کے معنی یہ ہیں کہ نیست کو نیست اور ہست کو ہست جانے۔ یہ ہے علم۔

## حقیقت کائنات

☆ عزیز! ان گرامی! آج دنیا جس چیز کو علم قرار دے رہی ہے، وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے قدوس جل مجدہ کی ذاتِ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی اور ساری کائنات میں جو کچھ ہے، اسی کی صفات کی ظہور ہے۔ اسی کے اسماء کا اور اسی کے افعال کا ظہور ہے اور یوں کہیے کہ حقائق کائنات، اٹھارہ ہزار عالم، یہ سب کچھ اسی ذاتِ واجب الوجود کا ظہور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا ہے اور خدا کے سوا کچھ نہیں۔ جس چیز کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہے، خدا کی قسم! اس کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ مستقل وجود اگر ہے تو صرف خدا کا ہے۔ واجب الوجود کا ہے اور جس قدر کائنات ہمیں نظر آ رہی ہے، سب اسی کے وجود کے ظلال ہیں۔ اسی کے وجود کا ظہور ہیں۔ اسی کے وجود کی حقیقتوں کی نمائندگی، کائنات کا ہر موجود ذرہ کر رہا ہے۔ میں کائنات کے وجود کی نشی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی عاقل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے علم، کلام کی بنیاد ہی حقائق کائنات کا ثبوت ہے کیونکہ جب تک ہم حقائق کائنات کو ثابت نہیں مانیں گے تو اس وقت تک ہم مخلوق کو خالق پر دلیل کیسے بنائیں گے؟ ہمارا تو نظریہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی جس چیز کو دیکھو، اسے دیکھ کر خدا کی ہستی کو پچھانوں اور کائنات کے ہر ذرہ کو دلیل قرار دو اور کہو کہ جس قدر اور زمین و آسمان خدا کے ہونے کی دلیل ہیں۔ ہم تو تمام حقائق کائنات کو خدا کی ہستی کی دلیل بناتے ہیں اور اگر یہ چیزیں ہیں نہیں تو پھر دلیل کس کو بنائیں گے؟ عدم کو تو دلیل بنا ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ہمارا نظریہ یہ ہے کہ حقائق کائنات موجود ہیں مگر ان کا وجود مستقل نہیں۔ مستقل وجود اگر ہے تو حفظ واجب کا ہے۔ تمام حقائق کائنات، اسی واجب کا ظہور ہیں۔ لیکن آج اس علم کا جو مفاد دنیا میں ہمارے سامنے ہے، وہ یہ کہ جو کچھ ہے، وہ صرف مادہ ہے اور خدا کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔ یعنی جو ہے اس کو نیست قرار دے دیا اور نیست کو ہست سمجھ لیا۔ کائنات کا وجود کوئی مستقل وجود نہیں ہے اور مستقل وجود حفظ خالق کائنات کا ہے۔ لیکن آج اس مادہ پرستی کی دنیا میں علم و فضل کے دھوکے کی دنیا میں، اس علم کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو ”تھا“ اس کو کہہ دیا کہ یہ ”نہیں“ اور جو ”نہیں“ تھا، اس کو کہہ دیا کہ یہ ”ہے“۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے



جو چاہے آپ حسین کرشمہ ساز کرے

☆ علم کا مقصد یہ ہے کہ عدم کو عدم جانے اور وجود کو وجود۔ ہست کو ہست جانے اور نیست کو نیست۔ اور یقین کیجئے کہ اس علم کا سرچشمہ فقط حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اس راہ میں لوگوں کو بڑی ٹھوکریں لگتی ہیں۔

☆ یہ وادی اتنی آسان نہیں کہ جہاں سے انسان آسانی سے گزر جائے۔ بڑے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے جو شاہراہ ہمارے لئے متعین کی ہے، اس کے متعلق زبان رسالت نے فرمایا کہ

فَرَكْتُمْ عَلَى مِلَّةٍ بِيضَاءٍ لَيْلِيَا وَنَهَارًا سَوَاءٍ

☆ میں نے تمہارے لئے وہ راہ بتائی ہے کہ تم آٹھ میچ کر گزر جاؤ، اس کے دن رات برابر ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ راہ سے ہٹے نہ پاؤ اور اگر راہ سے ہٹ گئے تو اُدھر بھی ہلاکت و تباہی کے گڑھے ہیں اور اُدھر بھی۔ کیونکہ وہاں ہلاکت کے گڑھوں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اور صراطِ مستقیم، یہ وہ راہ ہے کہ جس کے اندر کوئی کاٹنا نہیں، کوئی خطرہ اور خدشہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس صراطِ مستقیم پر اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے ہم کو لگایا ہے، وہ ہمارے لئے شاہراہِ علم و عمل ہے۔ ہماری زندگی کا پہلا ستون علم ہے جو کہ بنیاد ہے عمل کی اور عمل اس کی بنیاد پر تعمیر ہے۔

## حقیقت علم

☆ طلباء کی شخصیت کیا ہے؟ طلباء کا مقام کیا ہے؟ میں کوشت پوست کو طلباء کی شخصیت قرار نہیں دیتا۔ میرے لئے طلباء کی شخصیت کا وجود اس کا ذہن ہے جو علم کی طلب والا ہے۔ علم ایک نور ہے اور نور جہاں آتا ہے، ظلمت دور ہو جاتی ہے اور جہاں ظلمت دور نہ ہو کو یاد وہاں نور آیا ہی نہیں۔ طلباء کے راہِ راست پر ہونے کی علامت یہ ہے کہ جن طلباء کا ذہن صاف و روشن ہے تو خوب سمجھ لو کہ وہ طالب علم ہیں، علم کی راہوں پر چل رہے ہیں اور علم حاصل کر رہے ہیں۔ جو طالب علم اپنے ذہن کے اندر کوئی روشنی نہیں پاتے تو سمجھ لو کہ وہ علم سے محروم ہیں۔ علم ایک ایسا نور ہے جو دل و دماغ کو روشن کرتا ہے۔ طلباء جو اس نورِ علم سے محروم ہیں، ان کو ان امور کی طرف توجہ کرنا چاہئے جو اس کی راہ میں رکاوٹ اور مانع بنے ہوئے ہیں اور جو علم کے لئے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، ان رکاوٹوں کو دور کرے اور ان راہوں کو صاف کرے، جن راہوں سے ذہن اور دل کے اندر نور آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کا ذہن، علم کے نور سے منور اور روشن ہوگا تو پھر ان کا عمل اور کردار بھی روشن ہوگا کیونکہ عمل کی عمارت تو ہمیشہ علم کی بنیادوں پر قائم ہوا کرتی ہے۔ تاریک کردار اس کا ہوگا، جس کا دماغ تاریک ہوگا۔ طلباء کا معاشرے میں یہ مقام ہے کہ وہ اپنے ذہن کو روشن کر کے قوم کے ذہن کو روشن کریں۔ طلباء کی جس جماعت کا ذہن روشن نہیں، سمجھیے، وہ اپنے موقف پر نہیں۔ ان کا وہ مقام نہیں ہے تو طلباء کا پہلا مقام یہ ہے کہ وہ علم کے نور سے اپنے ذہن کو منور اور پھر وہی روشنی قوم تک پہنچا کر قوم کی ذہنی تاریکیوں کو روشنی میں بدل دیں۔ یہ طلباء کا معیاری اور بنیادی کردار ہونا چاہئے۔ اس کردار کو ادا کیے بغیر طالب علم کا کوئی ابتدائی مقصد ہے نہ انتہائی اور یہ روشنی جو تمہارے دماغوں کو صاف کرے گی، وہ مادی علوم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا حاصل کرنا اسلامی علوم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ مادے میں تاریکی ہے۔ وہ خود تاریک ہے۔ تاریکی کے تاریکی کے سوا کیا مل سکتا ہے۔ اگر آپ کو یہ نور حاصل کرنا ہے تو آپ اسلامی تعلیم کی طرف توجہ دیں۔

☆ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اسلامی علوم کیا ہیں؟ آپ شاید یہ کہیں کہ ”یہ ہمیں سائنس سے ہٹاتے ہیں، دنیا کے علوم سے ہٹاتے ہیں“ لیکن خدا کی قسم! کائنات کا کوئی علم ایسا نہیں جو غیر اسلامی ہو۔ اسلامی علم سے کیا مراد ہے؟ اسلامی علم سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کا علم تم حاصل کر دو یہ سمجھو کہ وہ چیز خدا نے بنائی ہے اس کی یہ صفت، یہ خصوصیت، یہ کیفیت اسی نے پیدا کی ہے، اس چیز کے اثرات کو دیکھتے جاؤ، ان خصوصیات کا تجزیہ کرتے جاؤ، جن چیزوں کے اندر حرارت ہے، اس چیز کی حرارت کو دیکھ کر حرارت پیدا کرنے والے کو پہچانو۔ کسی چیز کے اندر برودت ہے تو پھر اس سے برودت پیدا کرنے والے کو پہچانو۔ کیونکہ کسی پیدا کرنے والے کے بغیر کوئی چیز پیدا نہیں ہوا کرتی۔ اگر تمہارا دماغ حرارت و برودت کے اندر پھنس کر رہ گیا تو سمجھو کہ تاریکی میں مبتلا ہو گئے۔ اگر یہ سمجھا کہ وہ ٹھنڈک ہے، یہ گرمی ہے، یہ خشکی ہے، اس چیز میں فلاں صفت ہے، یہ تاثیر ہے، یہ خصوصیت ہے، ان تمام اثرات و خصوصیات کو معلوم کرتے چلے جاؤ اور حقائق کائنات سے واقف ہوتے چلے جاؤ اور جب کبھی حقیقت کا انکشاف ہو، سمجھو کہ حقیقت بنانے والے کے بغیر اس حقیقت کا وجود نہیں ہو سکتا۔

## ایک شبہ کا ازالہ



☆ یہاں ایک بات سمجھنا ضروری ہے کہ وہ طلباء جن کے ذہن مادی علوم میں گھرے ہوئے ہیں اور اسلامی علوم کی ہوائیں لگی، ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی ہے کہ یہ خدا کا تصور اور خدا کی ذات کا عقیدہ، محض ایک توہم ہے۔ لوگوں نے یوں ہی لوگوں کو ڈرانے کے لئے خدا کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دیا ہے۔ جیسے بچوں کو کہتے ہیں کہ ”ہوا“ آگیا ہے۔ ارے بھائی! اگر خدا نہیں تو یہ نظام کائنات آخر کیا ہے؟ ان کا کہنا ہے کہ مادہ کے اندر یہ صفات خود بخود موجود ہیں۔ ایک مادہ ایک وقت میں ایک حال میں ہے۔ پھر وقت گزرا، دوسرے حال پر آیا۔ پھر وقت گزرا تیسرے حال پر آیا۔ اس طرح مادے کے اندر جو خواص چھپے ہوئے ہیں، وہ ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ مادے کے اندر تمام ترقیات کے اثرات ہیں اور مادہ اپنے اپنے وقت میں ترقی کے منازل طے کرتا جاتا ہے۔ تو یہ تمام مادی خواص اور مادی اثرات ہیں۔ گندم کا ایک دانہ ہوتا ہے۔ اس کو زمین میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ ایک نرم و نازک شاخ کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم کئی گندم کی بالیاں حاصل کر لیتے ہیں تو یہ مادے کی خصوصیات اور اثرات ہیں جو اپنے اپنے موقعوں پر جیسا ماحول، ان کی کیفیات کے ظہور کے لئے مہیا ہوتا جاتا ہے، اس کے مطابق وہ مادے کے اثرات قائم ہوتے جاتے ہیں اور ان کے اپنے ذاتی اثرات ہیں۔ ان کی خصوصیات جو خود بخود ظاہر ہوتی ہیں، اس لئے نہیں کہ کسی بنانے والے نے بنائی ہوں یا پیدا کرنے والے نے پیدا کی ہوں۔

## ازالہ

☆ دیکھیے، یہ ایک ایسی بات ہے، جس کا جواب مشاہدات کی دنیا میں نہیں دیا جاسکتا اور اس کی وجہ یہ ہے، مشاہدات کی دنیا میں یہ سوال بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن میں نے ارخان، عمان کے طور پر یہ بات تسلیم کر لی اور اس کے بعد پھر میں جواب کی طرف آتا ہوں۔

☆ بات یہ ہے کہ تمام نظام کائنات کے بارے میں خدا کے منکروں کا مادہ پرستوں، مادی علوم کے ماہرین کا بنیادی نظریہ یہی ہے کہ مادے کے اندر جو یہ اثرات و خواص ہیں، وہ وقت آنے پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اب ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ مادے کے اندر ان اثرات و خواص کا مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں پایا جاتا جو کہ فعل و ظہور ہے تو اس کا تعلق کسی امر خارج کے ساتھ ہے یا یہ بھی مادے کی طرف سے ہے؟ انہوں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ یہ اثرات تو مادے ہی کے ہیں لیکن ان کا ظہور کسی سے متعلق نہیں بلکہ وہ ایک امر اتفاقی ہے۔ جیسا قضیہ اتفاقیہ ہوتا ہے یعنی اتفاق سے ایک مادہ سورج بن گیا، اتفاق سے ایک مادہ چاند بن گیا، اتفاق سے مادہ کے کچھ اجزاء نے مختلف صورتیں اختیار کر لیں۔ یہ تو محض اتفاق کی بات ہے۔ یہ نہیں کہ اس کا تعلق کسی خارجی حقیقت کے ساتھ ہو۔ رہا یہ کہ ان کا اس نوعیت کے ساتھ ظاہر ہونا، اس ظاہر ہونے میں، کسی ظاہر کرنے والے کا دخل نہیں بلکہ یہ قضیہ اتفاقیہ ہے، جیسا کہ اتفاق ہو گیا کہ آپ یہاں بیٹھے ہیں اور میں آیا۔ میں نے آپ کو دیکھ لیا۔ آپ نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے کچھ کہا، آپ نے میری باتیں سن لیں۔ یہ کیا قضیہ اتفاقیہ ہے۔ یہ ان مادہ پرستوں کا نظریہ ہے۔ اب میں اس نظریہ کو ایک دلیل سے توڑتا ہوں۔

☆ دیکھیے صاحب، جو چیز محض اتفاقی ہو، اس کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور اس نظام عالم کا کیا حال ہوگا؟ ذرا دونوں کے حال پر ایک نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اٹھارہ ہزار کائنات کا نظام انتظام منظم، انتظام بوط اور مستحکم ہے کہ ایک کڑی دوسرے کی کڑی سے جدا نہیں کی جاسکتی۔ چاند، سورج، ہوا، آگ اور پانی، جواہر و عناصر اسی طرح دیگر اجزاء ہیں۔ ان کا باہمی ربط کیا خوب ہے۔

☆ ہم جانتے ہیں اگر ہوا، پانی نہ ہو تو ہماری حیات باقی نہیں رہ سکتی۔ زمین نہ ہو تو ہم کہاں ٹھہریں گے۔ چاند سورج نہ ہوں تو ان کی طرف سے جو اثرات و خواص نباتات و جمادات پر مرتب ہوتے ہیں، وہ کہاں ہوں گے؟ درختوں، پھلوں اور غلوں کی لذتیں اور کونا کون مزیں اور پھر ہر چیز کا مختلف رنگ اور مختلف حالت میں ہونا، یہ سب چاند اور سورج کی گردشوں کے اثرات ہیں۔ جن سے یہ چیزیں رونما ہوتی ہیں۔ کھیتیاں اور پھل پکتے ہیں۔ کہیں حیوانات ہیں اور کہیں درخت، کہیں پانی اور آگ ہے، کہیں ہوا ہے، کوئی نظام اراضی ہے تو کوئی نظام مساوی۔ اسی طرح اگر ہم اپنے وجود پر بھی نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سر سے لے کر پاؤں تک ایک خاص ربط ہے۔ ہمارے بالوں کا رابطہ ہماری کھال کے ساتھ ہے۔ کھال کا رابطہ، گوشت کے ساتھ ہے اور گوشت کا رابطہ ہماری استخوان کے ساتھ ہے اور پھر ایک ایک رگ کا تعلق نیچے سے لے کر اوپر تک رابطہ ہے۔ اگر ہماری انگلیوں کے جوڑ نہ ہوں تو ہم انہیں کھول سکتے ہیں اور نہ بند کر سکتے ہیں۔ اگر یونہی ایک سیدھی سی ہڈی رکھ دی جاتی تو پھر یہ انگلیاں



سیدھی سی کھڑی رہیں۔ اگر ہماری پشت کے اندر مہرے نہ رکھے جاتے تو اٹھنا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ جسم ایک تختے کی طرح رہ جاتا۔ جسے چاہو کھڑا کر دو، چاہو تو لٹا دو۔ ہمارے گھٹنے کے جوڑاں نوعیت کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں کہ ہم ان کو سکینا چاہیں تو سکین سکتے ہیں، موڑنا چاہیں تو موڑ سکتے ہیں، سیدھا کرنا چاہیں تو سیدھا کر سکتے ہیں۔ ہماری آنکھیں، ہمارے کان، ہماری زبان، ہمارے دانت سب اپنی اپنی جگہوں پر لگے ہوئے ہیں۔ اب بتائیے کہ یہ دانت جو اللہ تعالیٰ نے منہ میں پیدا کئے ہیں اگر سر کے اوپر پیدا کر دیتا۔ بھئی یہ بھی تو قضیہ اتفاقیہ ہے! اتفاق سے کسی کے دانت سر پر ہی ہو جاتے تو کون سی بات تھی۔ کسی کی زبان آپ کان کی جگہ نہیں دیکھیں گے۔ کسی کا پاؤں سر پر نہیں دیکھیں گے۔ کسی کا پاؤں پیٹھے پر نہیں دیکھیں گے۔ یہ کیا ہے؟ ہمارے وجود کا نظام اتنا منظم، مربوط اور محکم ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

## نظام کائنات

☆ لیکن میرے دوستو! اگر اس نظام کو ہم قضیہ اتفاقیہ قرار دیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ جو عمل اتفاقیہ ہو جائے، اس کے اندر نظم و ضبط نہیں ہوا کرتا۔ یہ ارتباط اس بات کی دلیل ہے کہ کسی ارتباط پیدا کرنے والے نے ارتباط پیدا کیا ہے۔ کسی نظام قائم کرنے والے نے نظام قائم کیا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب آپ بازار میں چلتے ہیں تو آپ کس انداز سے چلتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کی رفتار غلط نہ ہو، آپ کا قدم زیادہ آگے نہ بڑھ جائے۔ آپ چھوٹا قدم نہ اٹھائیں۔ اتنی تیزی سے نہ چلیں کہ لوگ دیکھ کر آپ پر ہنسنے لگیں اور نہ اتنے آہستہ چلیں کہ لوگ سمجھیں کہ شاید یہ زمین سے چپکے ہوئے ہیں۔ تو آپ اتنا آہستہ نہیں چلتے، اتنا تیز نہیں چلتے، قدم آپ کا نہایت ہموار ہوتا ہے اور آپ کے جسم کی حرکات بالکل معتدل ہوتی ہیں اور آپ کے جسم کے تمام اعضاء بالکل اعتدال کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں لیکن کہیں کیلے کے چھلکے پر پاؤں پڑ گیا تو ہڑام سے گرے تو ایمان سے کہنا کہ آپ کا گرنا اتفاقی ہے یا نہیں۔ اب اس کرنے کو قضیہ اتفاقیہ کیسے اور اس نظم و ضبط کے ساتھ چلیے کہ آپ کو مربوط نظام کے تحت لائے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ جب آپ گریں گے تو گرنا اتفاقی ہے نا، لیکن کرنے میں کیا وہ نظم و ضبط باقی رہے گا؟ بتائیے، اگر اس منظم کائنات کو اتفاقیہ مان لیا جائے تو پھر کرنے میں نظم و ضبط ہونا چاہیے۔ کیونکہ کائنات کا نظم و ضبط تو ہمارے سامنے ہے۔ اس لحاظ سے گرتے وقت آپ خوب سمجھ کر گریں کہ پاؤں جہاں ہونے چاہئیں، وہیں ہوں۔ ہاتھ بالکل غیر کل پر نہ ہوں اور پاؤں بالکل نامناسب جگہ پر نہ ہوں اور سر کہیں ایسی نامناسب جگہ پر نہ ہو، جہاں سر کی توہین ہو جائے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ سر جہاں پڑ گیا، پڑ گیا۔ ہاتھ جہاں گر گئے، گر گئے اور پاؤں جہاں پڑ گئے، پڑ گئے۔ کوئی اس کے اندر نظم و ضبط نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ جو قضیہ اتفاقیہ ہوتا ہے، اس میں نظم و ضبط نہیں ہوا کرتا۔ چونکہ ساری کائنات میں نظم و ضبط ہے۔ اس لئے پتہ چلا کہ جہاں نظم و ضبط ہو، وہ اتفاقی بات ہے اور جہاں نظم و ضبط ہو وہ کسی ضبط قائم کرنے والے کی انضباط پر ہوا کرتا ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ کائنات کے ذرے ذرے کو دیکھو اور نظام قائم کرنے والے کی دلیل قائم کر کے اس کی ہستی کو پہچانو۔ کائنات کا ہر نظام دعویٰ ہے اور نظم اس کی دلیل۔ ہم مانتے ہیں کہ مادے کے اندر خواص ہوتے ہیں۔ جیسے پانی بارود راطب ہے۔ آگ حار یا بس ہے۔ حار کے معنی ہیں، گرم اور یا بس کے معنی ہیں، خشک۔ بارود کے معنی ہیں، ٹھنڈا اور راطب کے معنی ہیں ہر۔ آگ اور پانی دونوں متضاد ہیں۔ ایک خشک ہے اور دوسرا تر۔ ایک گرم ہے اور دوسرا سرد۔ لیکن یہ دونوں طرح کے اثرات مادہ گہرے نہیں لایا۔ یہ اثرات دینے والا خدا ہے۔ آگ کو حرارت دینے والا خدا ہے۔ جس نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے فرمایا، ”يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ“ کیونکہ حرارت میں نے دی ہے، اس لئے جب چاہوں گا، حرارت رکھوں گا اور جب چاہوں گا، سلب کر لوں گا۔ پانی کے اندر خواص میں نے رکھے ہیں۔ پانی کا کام سیال ہونا ہے لیکن جب چاہوں گا، کہہ دوں گا کہ اے نخل! ٹھہر جا، میرے کلیم گزرنے والے ہیں۔ پانی کا سیلاب، پانی کی سیال، پانی کا بہنا، یہ سب خواص میرے دیئے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ مادے کے ذاتی خواص ہیں بلکہ یہ میرے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ تو جو چیزیں میری پیدا کی ہوئی ہیں وہ پیدا کرنے سے پہلے بھی میری قدرت میں تھیں اور پیدا کرنے کے بعد بھی میری قدرت میں ہیں۔ میں چاہوں تو اس کو باقی رکھوں اور چاہوں تو فنا کر ڈالوں۔

☆ یہ ہے وہ بنیادی نکتہ، جس پر سارے علم کا دارومدار ہے۔ اس لئے میں کہوں گا کہ سائنس کا علم غیر اسلامی نہیں ہے۔ آپ دنیا کے کسی علم کو لے لیں، وہ خواہ ریاضیات سے متعلق ہو یا ارضیات سے۔ فلکیات سے متعلق ہو یا حقائق کائنات سے میں کہتا ہوں کہ ہر علم اسلامی ہے۔ مگر اسلامی جب ہوگا کہ جب ہر چیز کو جان کر اور ہر علم کو حاصل کر کے، خدا کا علم حاصل کیا جائے۔ آپ سائنس پڑھیں یا



ریاضی، جغرافیہ پڑھیں یا تاریخ، ان تمام علوم کا مرکز و محور خدا کی معرفت ہے۔ اور خدا کی ذات پر یقین ہے۔ یہ ایک بنیادی بات ہے۔ اگر آپ نے اپنی اسلامی تعلیمات کے کھوکھور کو چھوڑ دیا تو آپ کے ذہن کو آوارہ کر دیا جائے گا۔

☆ اسلامی تعلیمات کا مقصد صرف یہی نہیں کہ آپ قرآن مجید کے ترجمہ کے سوا کچھ نہ پڑھیں۔ آپ قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھیں اور جن چیزوں کا ذکر آپ نے قرآن میں پڑھا، ان کی حقیقتوں کو جاننے کیلئے آپ جدید تعلیم کی طرف بھی توجہ دیں۔ قرآن نے کہا، ”وَالسَّمَاءَ وَالْطَّارِقَ“ آسمان سے رات کو آنے والے لطیف اثرات زمین کے کرہ میں پیوست ہوتے ہیں اور پھر اس سے معدنیات کا ظہور ہوتا ہے۔ کہیں نباتات کا ظہور ہے تو کہیں جمادات کا۔ کہیں سکھیا پیدا ہو رہی ہے تو کہیں تریاق۔ کہیں لوہا پیدا ہو رہا ہے تو کہیں کوئلہ۔ اسی زمین میں لوہے کی، سونے کی، چاندی کی اور پٹرول کی کانیں ہیں۔ یہ جتنی چیزیں ہیں، یہ سب ”وَالسَّمَاءَ وَالْطَّارِقَ“ کے اندر مذکور ہیں۔

## آغوشِ مادر

☆ آج اگر ہمارے عزیز طلباء کے اندر کچھ کوتاہیاں ہیں تو یہ صرف ان کا قصور نہیں بلکہ یہ ان کے گہوارے کا قصور ہے، جس گہوارے کے اندر ہمارے طلباء کو تربیت دی گئی ہے۔ کیونکہ گہوارے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری قوم کی ماؤں اور بہنوں کی گود میں امام ابوحنیفہ جیسے لعل کھلا کرتے تھے۔ غالی، رازی، بوعلی سینا، بڑے بڑے علماء و صوفیاء، زہاد و مجاہد اور محدثین و مفسرین، یہ سب ہماری ماؤں اور بہنوں کی گود میں تربیت پانے والے ہوئے۔ تصوف کی طرف آئیے، حضور غوث پاک رحمہ اللہ جیسی مقدس ستیاں اسی قوم کی ماؤں اور بہنوں نے ایسے بچوں کو جنم دیا اور اپنی مبارک آغوش میں پالا اور اپنی تربیت سے انکے ذہنوں کو منور کیا۔

☆ عزیزانِ گرامی! یاد رکھیے کہ ہماری تربیت کا گہوارہ ہذا غلط ہے۔ گہوارے کے اثرات کے متعلق مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ عیسائی سلطنت روم کو فتح کرنے کے بعد، مجاہدین نے روم کی کوری چٹی عورتوں سے نکاح کرنا چاہا۔ امیر لشکر کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ میں تم کو اجازت نہیں دوں گا۔ حالانکہ قرآن کی رو سے جائز ہے۔ لیکن بہت سی چیزیں بعض اوقات مضمر ہو جاتی ہیں۔ مثلاً انار کھانا کوئی حرام نہیں، جائز ہے لیکن ایک شخص ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ انار کھائے تو اس کو بہت نقصان پہنچے گا۔ اس لئے ڈاکٹر منع کرے گا کہ انار مت کھانا، حالانکہ وہ جائز ہے۔ اس طرح بے شک عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ہے مگر بعض حالات ایسے ہوتے ہیں کہ جائز چیزیں مضمر ہو جاتی ہیں۔ تو امیر لشکر نے کہا کہ میں تم کو اجازت نہیں دوں گا۔ جب تک امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جواب نہ دیں۔ کیا پیارے الفاظ ہیں! اے فاروقِ اعظم! آپ پر خدا کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! عمر خدا کے حلال کو حرام نہیں کر سکتا اور خدا کے حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے حلال کیا، وہ حلال ہے لیکن اے میرے عرب کے مجاہد اور بہادر! میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم روم کی کوری چٹی عیسائی عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ اس لئے کہ اگر تم نے ان سے نکاح کیا تو ہوگا یہ کہ یہ بچے تمہارے ہوں گے اور ان کی گودوں میں پلیں گے اور تربیت پائیں گے تو مجھے خطرہ ہے کہ کہیں عرب کی تہذیب روم میں گم نہ ہو جائے۔

☆ اس واقعہ سے یہ بتانا مقصود تھا کہ تربیت کے ماحول کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہمارے عزیز طلباء کے اندر بڑی اچھی اچھی صلاحیتیں ہیں اور اگر یہ صلاحیتیں نہ ہوتیں تو وہ طلب علم کے میدان میں کیسے آتے؟ ان کا طلب علم کے میدان میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے اندر بڑی بڑی عظیم صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب اس کے باوجود بھی اگر کچھ کوتاہیاں پائی جاتی ہیں تو ان سب کو طلباء کے سر نہ تھوپا جائے بلکہ ان کو یہ بتایا جائے کہ جس آغوش میں یہ پل کر آئے ہیں، اس آغوش میں کچھ کوتاہیاں ہیں۔ ہماری قوم کے وہ ماں باپ، جن کی گود میں پل کر یہ بچے، طالب علمی کی صف میں آئیں تو ان کا کردار ایسا پیارا ہو، ان کی آغوش اتنی پاک ہو کہ اس آغوش میں پلے ہوئے بچے آگے چل کر قوم کی کایا پلٹ دیں۔ عزیزانِ محترم! خدا انخواستہ، اگر تمہارا ذہن گمراہ ہو گیا تو ساری قوم گمراہ ہو جائے گی۔ اگر تمہارا دماغ روشن نہ ہو تو قوم کا دماغ روشن نہیں ہو سکتا۔ اگر تمہارا کردار غلط ہو تو قوم کا کردار بھی غلط ہو جائے گا۔ تم نے قوم کے کردار کو بچانا ہے قوم کے دماغ کو روشن کرنا ہے۔ ملک کا مستقبل تمہارے دامن سے وابستہ ہے۔ تمہاری قوم کی فلاح قوم کی نجات قوم کی ذہنی نشو و نما اور قوم کی تمام ذہنی ارتقاء کا دار و مدار تمہارے اپنے ذہنی ارتقاء پر ہے۔ قوم کے ارتقاء کا دار و مدار اپنے کردار پر ہے۔ اس لئے تمہارا ذہن روشن اور کردار بلند ہونا چاہیے۔ تم اپنی اس روشن دماغی اور خوش کرداری کے ساتھ اپنی قوم کی، وہ وہ بہترین خدمت انجام دے سکتے ہو کہ جو خدمت محاشرے میں تمہارے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔



یہ مختصر سامیرا خطاب تھا۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میرے عزیز طلباء کو اس کی توفیق عطا فرما کہ وہ اپنے ذہن کو روشن اور کردار کو بلند کریں۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

WWW.KAZIMIIS.COM

## فلسفۂ نماز

بہ مقام: جامعہ اسلامیہ بہاولپور

☆ ”نماز“ فارسی زبان کا لفظ ہے جبکہ عربی اور قرآن وحدیث میں ”الصَّلَاةُ“ کا لفظ آتا ہے۔ ”الصَّلَاةُ“ کا لغوی مطلب ہے ”الذَّخْرُ بِالْخَيْرِ“ خیر کے ساتھ دعا کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ صرف ”دعا“ صلوٰۃ کا معنی نہیں۔ کیونکہ دعا عام ہے کہ وہ دعا، دعائے ضرر ہو یا دعائے نفع لفظ ”صلوٰۃ“ دعائے ضرر کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اس دعا کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے جو نفع اور خیر پر مشتمل ہو اور خیر سے متعلق ہو لفظ ”صلوٰۃ“ کے معنی ہیں دعا، جو دعا کے خیر ہو۔ دعائے نفع ہو۔ اصطلاح شرع میں ”الصَّلَاةُ“ سے وہ ارکان مخصوصہ مراد ہیں جن کی تشریح اور تفصیل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنے عمل مبارک سے فرمائی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کو سرکار سے سیکھا اور آج تک حضور ﷺ کی امت ان طریقوں کے مطابق نماز پڑھتی چلی آ رہی ہے اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اسی نماز کا ذکر بار بار فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا (النساء، آیت ۱۰۳)

ترجمہ ☆ ”بے شک نماز ایمان والوں پر فرض موقت ہے۔“

☆ ”فرض موقت“ یعنی جب وقت ہوتا ہے تو نماز کا ادا کرنا مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے۔ بہر حال نماز کا ذکر قرآن کریم میں بہت فرمایا گیا ہے بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے جس خصوصیت، جس اہمیت اور جس کثرت کے ساتھ نماز کا تذکرہ اور حکم قرآن کریم میں فرمایا ہے کسی اور چیز کے متعلق اتنی اہمیت اور کثرت کے ساتھ قرآن پاک میں حکم نہیں دیا۔

☆ قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر نماز کا تذکرہ فرمایا۔ نماز کی اہمیت کو بیان فرمایا۔ نماز کی تفصیلات قرآن کریم میں آپ کو نہیں ملیں گی۔ اس کی تفصیل کے لئے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ”صلوا کما رأیتمونی اصلی“ میرے صحابہ اہم اسی طرح نماز پڑھا کرو جیسا کہ تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا۔ کوئی نبی اکرم ﷺ نے اپنی سنت کریمہ سے نماز کی تفصیل بیان فرمائی اور وہی تفصیل ہمارے لئے قائل عمل اور قائل قبول ہے اور اسی پر ہمارا ایمان ہے تو قرآن کریم نے ”صلوٰۃ“ کی فرضیت کا ذکر فرمایا اور متعدد درجہ بار بار قرآن کریم میں نماز کا ذکر آیا اور رسول اکرم ﷺ نے نماز پڑھ کر ہمیں نماز کا طریقہ سکھایا۔ یہ دونوں باتیں اپنے ذہن میں رکھیے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں نماز کا مفہوم ہر مسلمان جانتا ہے۔ جب لفظ نماز مسلمان کی زبان



سے ادا ہوتا ہے اور قرآن وحدیث میں جب لفظ ”صلوٰۃ“ ہماری نظر سے گزرتا ہے تو ہر مسلمان کے ذہن میں اس کے مخصوص شرعی معنی واضح ہوتے ہیں اور اس کے مفہوم کے بارے میں اس کو کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ ”صلوٰۃ“ سے مراد ارکان مخصوصہ ہیں اور ان ارکان کی تفصیل سے مسلمان کا ایک ایک پچ اور ایک ایک فرد واقف ہے اور جو نماز کی تفصیل سے واقف نہیں کو یاد دہ مسلمان نہیں۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھیے۔ اس کے بعد میں عرض کروں گا کہ اس نماز کی حکمت کیا ہے؟ اس کی مصلحت کیا ہے؟ اس کے ساتھ کون کون سے منافع وابستہ ہیں؟ اس مقام پر میں اپنی فرومانگی کا اعتراف کرتا ہوں بلکہ میرا تو یہ ایمان ہے کہ اگر ساری دنیا کے علماء، حکماء اور عقلا کر نماز کی حکمتوں پر کلام کریں، تب بھی حق ادا نہ ہوگا اور کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہ کر سکے گا کہ میں نے نماز کی حکمتوں کو مکمل طور پر بیان کر دیا۔ البتہ جو چند باتیں میرے ناقص ذہن میں کتاب وسنت کی روشنی میں آئی ہیں۔ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ویسے تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ نماز حکیم مطلق کا حکم ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی حکمت کیا ہوگی؟ اور کوئی مسلمان اس سے بڑھ کر کسی حکمت کا متلاشی نہیں ہوتا لیکن لوگوں کے ذہن کو جاگر کرنے اور قلوب کو مطمئن کرنے کے لئے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ نماز کی حکمت اس وقت تک ہمارے ذہن میں صحیح طور پر واضح نہیں ہوگی، جب تک انسان کی ذات کا صحیح تصور ہمارے ذہن میں واضح نہ ہو۔

☆ انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ”روح اور بدن“ ایک روح حیوانی ہے جس سے انسان کی جسمانی حیات متعلق ہے اور پھر روح نباتی، جس کی وجہ سے انسان کے جسم کی نشوونما ہوتی ہے اور پھر وہ روح انسانی ہے کہ جس کی وجہ سے انسان انسان کہلاتا ہے اور اس کے علوم اس کے معارف اور اس کے ادراکات سب اسی کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ان تمام کو آپ خواہاں لگ لگ تصور میں لائیں۔ جیسا کہ بعض حکماء کا قول ہے۔ یا آپ بوعلی سینا کا نظریہ اختیار کر لیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر صرف ایک ہی روح ہے اور اس کی بہت سی قوتیں ہیں۔ اور ان قوتوں کی وجہ سے لوگوں نے ارواح کے تعدد کا قول کیا۔ لیکن درحقیقت متعدد درویش نہیں بلکہ انسان ایک ہی روح لے کر آیا ہے۔ اس کے اندر مختلف قسم کی قوتیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور اس کے لئے کچھ آلات پیدا کیے ہیں۔ وہی نفس کے آلات ہیں، جن کے ذریعے مختلف کام سرزد ہوتے ہیں۔ جبکہ پہلے قول کے مطابق حکماء نے کہا کہ انسان کے اندر علیحدہ نفس ہیں جو علیحدہ ارواح کے تابع ہیں۔

☆ بہر حال میری گزارش یہ ہے کہ انسان کی روح کو خواہ اس کے آلات اور قوتوں کے تعدد کے لحاظ سے آپ ذہن میں لائیں یا انسان کی روح اور اس کے نفس کے تعدد کے اعتبار سے اس کی تفصیلات ذہن میں لائیں۔ یہ مانتا پڑے گا کہ انسان جسم و روح کا مرکب ہے اور روح کا تعلق عالم امر کے ساتھ ہے۔ عالم بالا کے ساتھ ہے۔ جبکہ جسم کا تعلق اس عالم اسفل کے ساتھ ہے۔ اس عالم ناسوت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ جسم کے مشاغل اور جسم کی دلچسپیاں اس عالم دنیا اس عالم ناسوت سے متعلق ہیں۔ اگر انسانی مشاغل اور افعال صرف اسی دنیا تک محدود ہیں تو یہ روح جو عالم بالا سے آئی جو رب کا امر ہے ”امر“ الہی ہے۔ مشغول ہو جائے گی، پیاسی رہ جائے گی۔ جب انسان عالم ناسوت میں صرف جسمانی روابط میں، جسمانی خواہشات کی تکمیل میں اور جسمانی تقاضوں کو پورا کرنے میں منہمک رہے گا۔ تو انسان کا رابطہ اور تعلق، عالم بالا سے نہیں رہے گا اور جب تک اس کا رابطہ عالم ملکوت سے باقی نہ ہو رہے گا۔ اس کی انسانیت کا کوئی تصور قائم نہیں ہوتا۔ انسان حقیقی معنوں میں انسان اسی وقت ہے جب اس کا تعلق عالم ملکوت سے استوار ہے اور اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قائم رہے کہ جس اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے اس کو روح عطا فرمائی اور جس اللہ تعالیٰ نے اس کو جسم دیا اور جس اللہ تعالیٰ نے جسم اور روح کو ملا کر اسے انسان بنایا اور اس کے اندر انسانیت کے اوصاف اور خواص پیدا کیے۔ اس سے تعلق قائم رکھنا، انسانیت کی بقا کے لئے ضروری ہے اور یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ جو چیز جس عالم سے متعلق ہے، اسکی غذا بھی اسی عالم سے حاصل ہوگی۔ روح عالم بالا سے متعلق ہے، اس لئے اس کی غذا بھی اس عالم سے حاصل ہوگی۔ اگر انسان اپنی جسمانی ضروریات میں منہمک رہے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہی نہ ہو تو یقیناً یہ انسان بالکل ناسوتی ہو جائے گا۔ حیوانیت، بھیمیت، سہیبت اور درندگی کا مجسمہ ہو جائے گا۔ اس کے اندر کوئی معرفت نہ ہوگی۔ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی کوئی محبت نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ سے کوئی رابطہ نہ ہوگا۔ حالانکہ انسان کی پیدائش کا مقصد ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور معرفت ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت، انسان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ تو یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جب تک ہم نماز کو اختیار نہ کریں اور نماز کو قبول نہ کریں۔ نماز درحقیقت تخلیق انسان کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہے اور انسان کے ان روابط کو جن کے بغیر اس کی انسانیت برقرار نہیں رہ سکتی، انہیں مضبوط کرنے کے لئے ہے۔ دن اور رات میں اگر انسان پانچ وقت کی نماز نہ پڑھے، اس کے روابط بارگاہ الوہیت کے ساتھ برقرار نہیں رہ سکتے۔ اس کی کوئی عظمت، اس کی تخلیق کا جو اصل مقصد ہے، وہ پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ دنیا میں آ کر اپنے رب کی بارگاہ سے لا



تعلق ہوا اور ہمیشہ عالم ناسوت میں جسمانی خواہشات، جسمانی ضروریات کی تکمیل میں مہمک رہے تو اس کے اندر حیوانیت کا اس قدر غلبہ ہوگا کہ انسانیت کا کوئی نام و نشان نہیں رہے گا۔ لہذا ضروری ہے کہ جسم کے تقاضے اس عالم جسمانی کے ساتھ پورے ہوتے رہیں اور روح کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عالم ارواح کی طرف توجہ رہے۔ اس لئے انسان کے معمولات رب نے اس طرح مقرر فرمائے کہ جسم و روح دونوں کے تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ انسان صبح اٹھے اور سب سے پہلے اپنے رب کی بارگاہ میں سر بسجود ہو کہ اس نے اس بندے کو نیا دن دکھایا اور نیند جو آدھی موت ہے، نیند جو موت کی بہن ہے، اس سے بیدار فرمایا۔ اس طرح اپنے دن کا آغاز اس کے نام سے اور اس سے لو لگا کر کرے کہ شب بھر کی نیند جسم کا تقاضا تھا۔ اب صبح کو، روح کو خوراک نہ ملی تو جسمانی لذتیں اور راحتیں اس کو لے ڈوبیں گی۔ اس کے بعد انسان نے ناشتہ کیا اور پھر اپنے دنیاوی معمولات اور کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ آدھا دن گزر گیا، جسمانی، ذہنی مشقت نے بھوک کو چکا دیا، اس نے کھانا کھایا، لیکن صبح سے اب تک اسی دنیا سے تعلق رہا تو ضروری ہوا کہ روح کے تقاضوں کی طرف توجہ ہو، چنانچہ پھر آرام کیا، استراحت کی اور پھر دنیاوی کاروبار میں لگ گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا انہماک تاشدید ہو کہ عالم بالا سے اس کے رابطے مضل ہونے لگیں، اس کو ایک بار پھر نماز کا حکم ہوا، اس کے بعد اس نے گھر کا رخ کیا۔ بیوی، بچوں کے ساتھ وقت گزارا، تفریح کی، گھریلو ضرورتوں کو پورا کیا۔ یہ سب اس دنیا کے جھیلے ہیں۔ ان میں کھوکھوہ اپنے رب کی یاد سے غافل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ پھر مؤذن نے پکارا اور رب کی طرف بلایا اور غروب آفتاب کے وقت یہ پھر اس کی بارگاہ میں جسیں سائی کے لئے حاضر ہوا۔ اب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا، بھوک نے بھی ستایا۔ اس نے کھانا کھایا، بخار گندم نے بستر کی طلب کو برسا دیا۔ نیند نے آنکھوں میں ڈیرے ڈالے لیکن جس رب نے یہ دن عطا فرمایا اس کی ضروریات کو پورا فرمایا، اس کا شکر واجب ہے۔ اب وہ سونے والا ہے۔ کون جانے اس رات کے بعد زندگی کا دیا ٹھٹھائے گا یا بجھ جائے گا، صحرانورد ہوگی یا قبر کی تاریکی مقدر ہوگی۔ تو اب یہ ضرورت ہے کہ یہ اس طرح سوئے کہ اگر قبر میں آنکھ کھلے، شب بھی گھبراہٹ اور ندامت نہ ہو۔ ایمان اور ایمان کے تقاضوں کی تکمیل کر کے سوئے۔ چنانچہ بستر میں جانے سے پہلے پھر اپنے رب کی بارگاہ میں حاضری دے۔

☆ مختصر یہ کہ پانچ وقت کی نمازیں اس لئے ہیں کہ یہ انسان جو جسمانی اور حیوانیت کا مرکب ہے، تحت اور فوق کا مجموعہ ہے۔ اس عالم انہماک کا اور اس عالم بالا کا مجموعہ ہے۔ فلق اور امر کا مجموعہ ہے۔ اس کی جسمانی حاجات تو اسی عالم دنیا میں پوری ہوتی رہیں اور ساتھ ساتھ اس کی روح کے تقاضوں اور حاجتوں کی تکمیل کا سامان بھی ہوتا رہے۔ جسم اور روح دونوں کی ضروریات کا لحاظ ضروری ہے۔ اگر انسان کو صرف روحانیت کی طرف توجہ کر دیا جائے مثلاً ایک شخص کو کہا جائے کہ بھائی، تمہاری روح کا تقاضا یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ نماز پڑھو، روزہ رکھو، قرآن پڑھو اور تم درود شریف پڑھو بلکہ تم درود شریف ہی پڑھئے رہو کہ یہ روح کا تقاضا ہے اور ذکر الہی ہی کرتے رہو کہ یہ روح کی غذا ہے کیونکہ ”لَا يَذْكُرُ اللَّهَ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ“ اور اگر وہ روٹی مانگے تو کوئی بھائی، روٹی تو ایسی چیز ہے جو تکلیف ہے۔ اس کے اندر مادیت ہے اور اس کے اندر ایک قسم کی ظلمت کے اثرات ہیں۔ لہذا تم اللہ اللہ کرتے رہو۔ بھلا کتنا عرصہ ذکر الہی میں مشغول رہ سکتے گا۔ نہ آپ اسے روٹی کھائیں نہ اسے آپ پانی پلائیں، نہ موسم کے سرد گرم سے اسے بچائیں تو یقیناً ایک وقت ایسا ہوگا، جسمانی نظام برباد ہو جائے گا اور اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح جسم کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے تو جسمانی زندگی برقرار نہیں رہ سکتی، اسی طرح اگر روح کی حاجتوں اور اس کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے تو روحانی زندگی کا نظام برقرار نہیں رہ سکتا اور یہ فقط اسلام کی خصوصیت ہے کہ اسلام نے جہاں جسمانی تقاضوں کو پورا کیا ہے وہاں روحانیت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور جسم کے تقاضوں کو وہاں رکھا، جہاں جہاں جسم کا تعلق تھا۔

☆ جسم کے اندر جو ہریت ہے۔ علم جو ہریت کو ہمارے روابط کا مرکز بنادیا اور ہمارے جسم کے اندر نباتیت ہے تو نباتات کو ہماری جسمانی ضرورتوں کے انتضاء کا ایک دوسرا مرکز بنادیا اور ہمارے اندر حیوانیت ہے۔ تو عالم حیوانیت کو ہماری جسمانی ضرورتوں کے انتضاء کا تیسرا مرکز بنادیا۔ غرض یہ کہ جسم کے روابط جہاں جہاں ہیں، جس جس مقام پر ہیں، وہاں وہاں سے اس کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ اگر جسم کی دنیا کو آپ دیکھیں تو آپ کو حیرت ہوگی۔ جسمانیات کا یہ عالم ہے کہ آپ تمام عالم جسمانی پر ایک نظر ڈالیں تو میں دھوئی سے کہوں گا کہ عالم جسمانی کی کوئی حقیقت ایسی نہیں ہے جو ہمارے جسم کے اندر مخفی نہ ہو اور جس کی لطیف حقیقت ہمارے جسم کے اندر نہ پائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جسمانی حالتوں کے پورا ہونے کے لئے ہمیں ضرورت ہوتی ہے کہ ہم مبنی استعمال کریں اور ہم غلہ استعمال کریں اور جمادات کو استعمال کریں۔ علم الابدان کے ماہرین جانتے ہیں کہ جسم میں دھاتیں بھی ہوتی ہیں، مٹی کا جو ہر بھی ہے اور بے شمار ایسے مرکبات جو بظاہر انسانی زندگی کے لئے مہلک اور



تقصان دہ معلوم ہوتے ہیں، وہ بھی جسم انسانی کا حصہ ہیں۔ بلکہ انسان کو عالم صغیر کہا جاتا ہے اور یہ تمام دنیا، یہ عالم کبیر ہے اور ایسا کہنے کی وجہ یہی ہے کہ تمام جہانوں کی حقیقتیں انسان کے اندر رکھ دی گئی ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ معدنیات ہوں، نباتات ہوں یا جمادات، تمام حقائق کائنات کی لطیف حقیقتیں ہمارے جسم کے اندر ہیں اور ساتھ ہی تمام عالم ارواح کی لطیف حقیقتیں بھی ہماری روح میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لئے جسم کی ترکیب جن جن مقامات پر جا کر رکتی ہے، ان تمام مقامات کو جسمانی ضرورتوں کا مرکز بنادیا۔

☆ اس مقام پر میں مختصر طور پر چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نبی اکرم سید عالم ﷺ نے کلمہ شہادت کے بعد سب سے پہلے جو چیز ہمارے لئے سب سے زیادہ ضروری قرار دی، وہ نماز ہے۔ دیکھیے حضرت سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی متفق علیہ حدیث بار بار آپ نے نبی، ہزاروں مرتباً آپ نے نبی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، ”نبی الاسلام علی خمس“ پانچ چیزوں پر اسلام کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ سب سے پہلی چیز کیا ہے، ”شَهِادَةُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ“ اس بات کی سچے دل سے کوئی دینا اور علم تہنی کا زبان سے اظہار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بے شک محمد ﷺ اللہ کے عبد مقدس اور اس کے رسول برحق ہیں اور پھر کیا؟ یہ پہلی بنیاد تھی، دوسری بنیاد کیا ہے؟ ”اَقَامَ الصَّلٰوةَ“ نماز قائم کرنا۔ دیکھیے کلمہ شہادت کے بعد ”اَقَامَ الصَّلٰوةَ“ کا ذکر فرمایا، کلمہ شہادت تو مسلمان ہونے کے لئے پڑھنا ضروری ہے۔ جب تک کلمہ نہیں ہوگا، بندہ مسلمان نہیں ہوگا۔ اب جب اس نے کلمہ پڑھ لیا تو اسے نماز کا حکم ملا، معلوم ہوا کہ اسلام میں سب سے زیادہ فوقیت نماز کو دی گئی ہے۔ میں آپ سے صحیح عرض کرنا ہوں کہ اسلام کے معنی کو ایک طرف رکھیں اور نماز کے معنی کی تفصیل ایک طرف رکھیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ اسلام اجمال ہے اور نماز اس کی تفصیل۔ ”نَبِیُّ الْاِسْلَامِ عَلٰی خَمْسٍ شَهِادَةُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ، سُوْجُوْدٌ، اِسْلَامُ کے دو معنی ہیں، ایک تو اس کے فتویٰ معنی، اسلام کے فتویٰ معنی کیا ہیں؟ گردن نہاد، بطاعت، طاعت میں گردن کو رکھ دینا، یہ اسلام ہے۔ ہم اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔ یہ اسلام کے ظاہری معنی ہیں لیکن حقیقت اسلام یہ نہیں ہے۔ حقیقت اسلام اس وقت ہوگی، جس طرح ہم نے سر کو جھکا دیا، اسی طرح اپنے قلب کو بھی اپنے رب کے سامنے جھکا دیں اور اگر خالی سر جھک گیا اور ہمارا دل سرکش رہا تو پھر وہ اسلام نہیں پھر وہ نفاق ہے، جیسے ہمارا سر جھک گیا، اسی طرح ہمارا دل بھی جھک جائے، یہ اسلام کا حقیقی معنی ہے اور غور کیجیے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں تو ہمارا دل بھی جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اے مومن! جب تیری روح نماز پڑھتی ہے تو سر بھی جھکا ہوتا ہے۔ تیرا دل بھی جھکا ہوا ہے، تیری روح بھی جھکی ہوئی ہے اور میں تو پھر یہ کہوں گا کہ فقط روح نہیں ہے بلکہ جس قدر کامل ایمان ہوگا، جس قدر معرفت کے درجات سامنے ہوں گے، اسی قدر نماز زیادہ کامل ہوگی۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ انسانیت کے دامن میں تمام حقائق کائنات سمٹے ہوئے ہیں تو جب انسان خدا کے دربار میں جھکتا ہے تو جس قدر وہ اپنی حقیقت انسانیت کے عرفان کے ساتھ جھکے گا اور اپنی حیثیت اور حقیقت کا جس قدر زیادہ علم ہوگا، اسی قدر نماز کامل ہوگی اور یہاں تک کہ جب اسے یہ یقین کامل ہو کہ اس کی ذات میں تمام کائنات کے حقائق جمع ہیں تو اس انسان کے سر جھکانے کے ساتھ یوں کہیے کہ تمام کائنات اس کے ساتھ رب کائنات کی بارگاہ میں جھک جائے گی۔ اسی لئے جب صدیق اکبر کا سر جھکتا تھا، فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر جھکتا تھا، عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر جھکتا تھا تو لوگوں کی نظروں میں صرف انہی کا سر جھکتا تھا مگر میں کہتا ہوں کہ جب وہ سجدہ کرتے تھے تو تمام عالموں کی حقیقتیں ان کے سجدوں کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتی تھیں اور میں تو جانتا ہوں کہ بندہ جس قدر خدا کی بارگاہ میں جھکتا ہے، اسی قدر خدا کی کائنات خدا کے بندے کے ساتھ التفات اور تعلق رکھتی ہے۔ جس قدر بندہ خدا کے ساتھ سرکش بنتا ہے۔ اسی قدر کائنات بندے سے سرکش ہو جاتی ہے۔ تو ”اسلام“ کا لفظ ایک طرف رکھو اور ”صلوٰۃ“ کا ایک طرف رکھو ”صلوٰۃ“ کے معنی کو آپ ڈھونڈیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام کی پوری پوری تفصیل آپ نماز کے اندر پاتے چلے جائیں گے۔ کس طرح، اسلام کا معنی سر جھکانا اور نماز کے دوران ہم اپنی پیشانی اللہ کے حضور زمین پر رکھ دیتے ہیں، سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ یہ تو اسلام کے فتویٰ معنی ہیں جو نماز میں پائے گئے۔ لیکن اگر اسلام کو دیکھیں تو اس کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ کلمہ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اگر کلمہ شہادت پر کلام کریں تو نماز میں کلمہ شہادت ہے۔ آپ التیحات میں بیٹھتے ہیں تو پڑھتے ہیں

اَلتَّحِيٰتُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالطَّيِّبٰتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَکَاتُہُ ط اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُہُ وَ رَسُوْلُہُ ط

☆ اب دیکھیے، ہم نے کلمہ شہادت نماز میں پڑھا۔ پورا کلمہ شہادت پڑھا

”اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُہُ“



وَرَسُولُهُ ط“ تو کلمہ شہادت نماز کے اندر موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز بذاتِ خود نماز ہے۔ یہ دو چیزیں ہوئیں۔ اب تیسری چیز کیا ہے؟ ”وَأَيُّهَا الرُّسُلُ“ ”زکوٰۃ ادا کرنا“ تو بے شک زکوٰۃ کے جو معنی اصطلاحی، شرعی ہیں، وہ تو یہاں نہیں پائے جاتے لیکن اتنی حقیقت سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کر سکتا کہ زکوٰۃ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا دیا ہوا مال اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لئے خرچ کیا جائے۔ خواہ وہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو، کسی وقت ہو، کسی نوعیت سے ہو۔ خدا کی راہ میں ہو اور خدا کی رضا کے لئے ہو۔ خدا کا دیا ہوا مال خدا کی راہ میں اس کی رضا کی خاطر خرچ کیا جائے۔ یہ زکوٰۃ کی لطیف حقیقت ہے۔ اور میں عرض کرنا ہوں، اگر آپ ذرا تامل سے کام لیں تو آپ نماز میں اس حقیقت کو پائیں گے اور نمایاں طور پر پائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے علماء نے نماز کو عبادتِ بدنیہ میں شمار کیا اور نماز یقیناً عبادتِ بدنیہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن زکوٰۃ کی لطیف حقیقت نماز کے اندر پائی جاتی ہے۔ دیکھیے، نماز کے لئے عورت پر سارے جسم کا چھپانا فرض ہے اور مرد کے لئے ناف سے گھٹنوں تک جسم کا چھپانا فرض ہے۔ جس کپڑے سے، جس لباس سے نمازی نے اپنے بدن کو چھپالیا، وہ کپڑا اور وہ لباس شرعاً مال ہے اور جب تک اس مال کو خدا کے لئے خرچ نہ کیا جائے، خدا کی رضا کے لئے استعمال نہ کیا جائے، اس وقت تک نماز ادا نہیں کی جاسکتی تو نماز کے فرض کو پورا کرنے کے لئے اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کرنا ضروری ہوا۔ وہ لباس، وہ کپڑا، جو ہم نماز ادا کرنے کے لئے اللہ کی راہ میں خرچ کر رہے ہیں، زکوٰۃ کی وہ لطیف حقیقت ہے جو نماز میں پائی جاتی ہے۔ اب دین کے چوتھے ستون کی طرف آئیے۔ بظاہر نماز میں روزہ نہیں۔ لیکن یہاں بھی باریک بینی درکار ہے۔ جب ہم نماز ادا کرنا شروع کرتے ہیں تو وہ مغلظاتِ ثلاثہ، وہ امور جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، ان سے اجتناب ضروری ہوتا ہے۔ نماز کا آغاز کر کے تکبیر تحریمہ کہہ کر اگر آپ کھانا کھائیں تو آپ کی نماز نہیں ہوگی۔ جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اگر ان میں سے کوئی کام انجام دیں تو نماز نہیں ہوگی۔ گویا جتنی دیر تک ہم نماز پڑھیں گے، اتنی دیر تک روزے سے رہیں گے۔ کوئی ویسے روزے سے ہو یا نہ ہو، اگر نماز پڑھے گا تو جتنی دیر تک نماز پڑھے گا، اتنی دیر کے لئے اسے روزہ رکھنا پڑے گا کہ جب اس نے ”اللّٰهُ اکْبَرُ“ کہا تو ”السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“ تک اسے روزہ دار رہنا پڑے گا۔

☆ اب اسلام کے پانچوں رکن حج کی بات کریں۔ ممکن ہے، آپ سوچیں گے کہ نماز میں حج تو ہرگز نہیں ہے۔ نہ وہاں طواف ہے، نہ صفا و روضہ کی سعی ہے، نہ وقفہ عرفہ۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے گویا یہ فرمایا کہ اے میرے بندو! اگر تم پانچ وقت دن میں کعبے نہیں جاسکتے تو کعبے کی طرف منہ کر کے تو کھڑے رہ سکتے ہو۔ یہ تمہارا کعبے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونا اور قیام کرنا اور رکوع کرنا، سجدہ کرنا اور یہ اراکانِ صلوٰۃ کو ادا کرنا، یہ حج کی حقیقت ہے جو نماز میں رکھ دی ہے۔ نہ کعبے کے بغیر حج ہوتا ہے اور نہ کعبے کی طرف منہ کیے بغیر نماز ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی ظاہر ہے کہ حج کے لئے احرام ضروری ہے اور احرام میں وہ چیزیں جو عام حالت میں انسان کے لئے حلال اور جائز ہوتی ہیں۔ مثلاً بالترشوانا، ناخن کاٹنا، خوشبو لگانا اور خوشبودار چیزیں استعمال کرنا بغیر ضرورتِ غسل کرنا وغیرہ احرام باندھتے ہی، یہ حلال چیزیں انسان کے لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ گویا جس طرح حج کا احرام باندھتے ہی حلال چیزیں انسان کے لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ”اللّٰهُ اکْبَرُ“ (تکبیر تحریمہ) نماز کا احرام ہے اور ”السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“ یہ نماز کی تحلیل ہے۔ ”اللّٰهُ اکْبَرُ“ کہتے ہی بعض وہ چیزیں جو ویسے حلال اور جائز تھیں، اب ناجائز ہو گئیں۔ یہ کب تک ناجائز رہیں گی، جب ہم ”السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“ کہیں وہ تکبیر ہے اور یہ اس کی تحلیل ہے۔ اس طرح حج کے احرام کی طرح نماز کی تکبیر تحریمہ ہے۔ یہ نماز اور حج میں ایک اور مناسبت ہے۔ یہ حج کی لطیف حقیقت تھی جو نماز کے اندر رکھ دی گئی۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ نماز کے اندر چونکہ اسلام کے تمام بنیادی ارکان کی اصل اور روح پائی جاتی ہے۔ اس لئے اسلام کی روح نماز ہے۔ اسلام کے تمام ارکان کا خلاصہ نماز ہے۔ شہادتین کی بنیاد نماز کے اندر موجود ہے۔ زکوٰۃ کی پاکیزہ اور لطیف حقیقت نماز کے اندر موجود ہے۔ اسی طرح روزے اور حج کی پاکیزہ اور لطیف حقیقت نماز کے اندر موجود ہے۔

## ایک شبہ

☆ لیکن اس مقام پر ایک شبہ کا زائلہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ میں جب ہم نے نماز پڑھ لی تو اب زکوٰۃ دینے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ وہ ادا ہو گئی اور اب روزہ رکھنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بھی نماز میں رکھ لیا گیا اور حج کی کوئی حاجت نہیں رہی کیونکہ نماز پڑھ لینے کے بعد حج کی حقیقت بھی ہمیں حاصل ہو گئی۔



## شبہ کا ازالہ

☆ تو اس کے جواب میں گزارش ہے کہ نماز کے اندر ان لطیف حقیقتوں کو اس لئے نہیں رکھا کہ نماز پڑھ کر ہم بہانہ بنالیں اور باقی ارکان کو چھوڑ دیں۔ بلکہ نماز میں ان لطیف حقیقتوں کو رکھنے کی حکمت یہ تھی کہ نمازی جب نماز پڑھے اور یہ لطیف حقیقتیں اس کی نماز میں پائی جائیں تو صرف نماز کی ادائیگی سے تمام ارکان اسلام کی ادائیگی مسلمان کے لئے آسان ہو جائے۔ جب وہ دن میں پانچ مرتبہ ان تمام ارکان کی تمام حقیقتوں کو محسوس کرے گا تو ارکان کی ادائیگی اور انجام دہی کے وقت گریز و اجتناب سے کام لینے کی بجائے، ان کی بجا آوری میں مشغول ہو جائے گا۔ جب دن میں پانچ مرتبہ وہ معبودان باطلہ کا انکار کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے اور حضور اکرم ﷺ کی رسالت کا اقرار کرے گا تو اس کا سر کبھی خدا کے علاوہ کسی اور کے آگے نہ جھکے گا اور جب زکوٰۃ دینے کا وقت آئے گا تو نماز کی روح مال کی محبت کا شکار ہو کر زکوٰۃ کی ادائیگی سے گریز نہ کرے گی کیونکہ زکوٰۃ کی لطیف حقیقت تو اس کی روح میں پہلے پیوست ہو چکی ہوگی اور جب روزہ رکھنے کا وقت آئے گا تو نماز کی روح کبھی اس سے انکار نہ کرے گی اور جب حج کی ادائیگی کا سوال آئے گا تو نماز کی روح اس سے فرار کی راہ تلاش نہ کرے گی۔

☆ بندہ جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور نماز شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہتا ہے۔ مختلف احادیث میں بظاہر مختلف الفاظ ہیں۔ بعض احادیث میں سر تک بعض میں کانوں تک اور بعض میں شانوں تک ہاتھ اٹھانے ذکر آیا ہے۔ جس کے بارے میں فقہانے تصریح فرمائی کہ ہاتھ اس طرح اٹھاؤ کہ اگر انگلیوں کا اعتبار کرو تو دوسرے کے مقابل ہوں، اگر ہتھیلیوں کو دیکھو تو وہ کانوں کے برابر ہوں اور اگر کلائی کو پوش نظر رکھو تو وہ شانوں تک ہو، گویا تمام احادیث پر عمل ہو جائے۔ بہر حال، اگر کوئی شخص فقہاء کی اس تحقیق سے اتفاق نہ کرے، تب بھی وہ ہاتھ اتنی بلندی تک ضرور اٹھائے گا کہ دیکھنے والے کو بخوبی اندازہ ہو کہ نماز پڑھنے والے نے نماز کی نیت کر لی ہے اور تکبیر تحریر یہ کہہ لی ہے۔ بندہ ہاتھ اٹھا کر ”اللہ اکبر“ کہتا ہے۔ نماز کی ہر حرکت اور ہر سکون میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ بندہ تکبیر تحریر یہ کہتے ہوئے، باقی دنیا سے ناظر و ذکر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے۔ گویا وہ یہ کہتا ہے کہ اے میرے مولا! میں اپنے جسمانی تقاضوں کی تکمیل اور دنیاوی کاروبار میں اسٹاک کے باعث تیری بارگاہ سے دور رہا اب جبکہ میں تیرے حضور کھڑا ہوں تو اقرار کرتا ہوں کہ تو سب سے بڑا ہے۔ کچھ لوگ پتھروں کے بنائے ہوئے بتوں کو پوجتے ہیں، کچھ درختوں اور پہاڑوں کے سامنے سجدہ رہتے ہوئے ہیں، کچھ چاند سورج کی پرستش کرتے ہیں، کچھ وہ ہیں جو پانی یا آگ کی پوجا کرتے ہیں۔ معبودان باطلہ کی عبادت کرتے ہیں، میرے مالک! میں تیری کبریائی کا اقرار اور اعلان کرتا ہوں کہ تو سب سے بڑا ہے، مناظر فطرت ہوں یا مظاہر قدرت، ہر شے تیری مخلوق ہے، تیری صنعت اور کارگیری کا نمونہ ہے تو خالق و مالک ہے تو سب سے بڑا ہے۔ تیرے مقابلے میں کوئی کچھ نہیں ہے اس لئے اب جبکہ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور تیری کبریائی کا اعلان کرتا ہوں تو میں دنیا اور اس کی ضرورتوں سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، اپنے کاروبار اور اپنی زمین جائیداد سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، اپنے رشتے ناٹوں، اپنی اولاد سے ہاتھ اٹھاتا ہوں کہ اب تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور تو سب سے بڑا ہے، سب سے بڑا ہے اور وہ صرف ایک دفعہ یعنی نیت باندھتے ہوئے تکبیر تحریر یہ کہتے ہوئے اللہ اکبر نہیں کہتا بلکہ رکوع، سجدے اور قعدے میں جاتے ہوئے ہر بار بھی اللہ اکبر کہتا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح میں مشغول ہے

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ (س بنی اسرائیل آیت ۴۴)

☆ ”کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔“ ہر چیز کی تسبیح اس کی شان اور اس کے حال کے مطابق ہے۔ جو جس حال میں ہے، اسی حال میں رب کی تسبیح میں مشغول ہے۔ اگر درختوں اور پہاڑوں کو دیکھیں تو وہ حالت قیام میں اس کی تسبیح کرتے نظر آتے ہیں۔ اوپر آسمان اور نیچے چو پائے حالت رکوع میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ کہہ رہے ہیں۔ حشرات الارض وغیرہ سجدے کی حالت میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ پکار رہے ہیں۔ زمین اور اس کے ساتھ کی چیزیں حالت قعود میں اپنے رب کی الوہیت اور عظمت کی کواعی دیتی معلوم ہوتی ہیں۔ آبیہار اور دریا حرکت کی حالت میں رب کی عبادت کر رہے ہیں اور پتھروں کی چٹانیں سکون کی کیفیت میں اس کی یاد میں محسوس ہوتی ہیں۔ غرض قیام و قعود، رکوع و سجود، حرکت و سکون، جس حال میں جو چیز جہاں ہے، اپنے خالق و مالک کی تسبیح و ثناء میں مصروف ہے۔

☆ چونکہ انسان تمام عالموں اور کائنات کی ہر شے کی حقیقتوں کا جامع ہے اس لئے ضروری تھا کہ اس کی عبادت بھی تمام کائنات

اور ہر مخلوق کی عبادت کا مجموعہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمام موجودات کی عبادتوں کے مختلف اور متعدد طریقے انسان کی عبادت میں شامل کر



دیئے۔ قیام وقعود، رکوع و سجود، تمام مخلوق کی عبادت کا عنصر ہیں اور نماز میں حرکت بھی ہے، سکون بھی، قیام وقعود اور رکوع و سجود کے وقت اور حرکت و سکون کے وقت بندہ ”اللّٰهُ اکْبَر“ کہتا ہے۔ گویا جب وہ حالت قیام کے لئے ”اللّٰهُ اکْبَر“ کہتا ہے تو ان تمام چیزوں کی طرف سے خدا کی کبریائی کا اعلان کرتا ہے جو حالت قیام میں اس کی تسبیح کر رہی ہیں اور جب وہ رکوع میں جاتے ہوئے ”اللّٰهُ اکْبَر“ کہتا ہے تو یہ اعلان اس ساری مخلوق کی طرف سے ہے جو حالت رکوع میں جو عبادت ہے اسی طرح سجدے اور قعود کے لئے اس کا ”اللّٰهُ اکْبَر“ کہتا گویا سجدے اور قعود کی حالت میں حمد و ثنا کرنے والی جملہ مخلوق کی نمائندگی ہے۔

☆ اب بندہ تکبیر تحریر کر رہا ہے کہ کثرت پڑھتا ہے اور اس کے بعد سورہ فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے۔ سورہ فاتحہ تو اسے ہر رکعت میں پڑھنی ہے۔ اس سورت میں کتنے امرا و رموز ہیں؟ کتنے مجید ہیں؟ مجھے سنا قصہ الفہمان کا ادراک کیسے کر سکتا ہے؟ یہ تو ان برگزیدہ ہستیوں کا کام ہے کہ کسی نے کہا

حرمین	بادہ	ہا	خوردند	ورقند
تمی	نخجاند	ہا	کرند	ورقند

☆ وہ حضرات اس کے اہل ہیں۔ بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ بندہ جب سورہ فاتحہ پڑھتا ہے، کہتا ہے، ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ”حَمْدُنِي عَبْدِي“ میرے بندے نے میری حمد کی ہے۔ پھر بندہ کہتا ہے، ”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى الرَّسُولِ“ تو اللہ کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے، ”اَلْنَسِي عَلَيَّ عَبْدِي“ میرے بندے نے میری ثناء کی، پھر بندہ کہتا ہے، ”مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ تو رب فرماتا ہے، ”مَعْدِنِي عَبْدِي“ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی اس کے بعد بندہ کہتا ہے، ”اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ“ تو ارشاد ہوتا ہے، ”هَذَا لِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلُ“ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے۔ معبود ہونا، یہ میری الوہیت کا تقاضا ہے اور مدد مانگنا، تیری مددگی کا تقاضا ہے تو میرے بندے نے جو کچھ مانگا، وہ سب کچھ اس کے لئے ہے اور بندے نے کیا مانگا، ”اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ“ مجھے صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما۔ بندہ رب کی بارہ میں عرض گزار ہے، ”اِهْدِ“ ہدایت فرما۔ یہ صیغہ امر کا ہے۔ جب خطاب کرنے والا بندہ ہو اور مخاطب رب ہو اور صیغہ امر کا ہو تو وہ ہمیشہ عاجزی، تذلل اور دعا کے معنی میں ہوتا ہے۔ حالانکہ امر کے اندر استعلاء ہوتا ہے لیکن جب یہ صیغہ استعمال کرنے والا بندہ ہے اور جس کو مخاطب کر کے یہ امر کا صیغہ بول رہا ہے، وہ خالق و مالک کائنات ہے، معبود حقیقی ہے تو اس کا یہ خطاب دراصل اس کی عاجزی ہے اس کا تذلل ہے اس کی دعا ہے۔ یہ التجا ہے، مولانا! ہمیں سیدھی راہ دکھا دے، صراطِ مستقیم پر چلا دے، صراطِ مستقیم کی ہدایت دے دے۔ کیا یہ بندہ، یہ التجا کرنے والا، یہ دعا مانگنے والا، نماز پڑھنے والا۔ سیدھے راستے پر نہ تھا؟ یہ مسلمان ہے۔ یہ کلمہ کو ہے۔ یہ عبد ہے۔ یہ نمازی ہے۔ اس نے وضو کیا ہے۔ پاک لباس پہنا ہے۔ مسجد میں آیا ہے۔ تذلل اور خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے رب کے دربار میں ہاتھ باندھے سر جھکائے عرض گزار ہے۔ اے رب، اے رحمن و رحیم، اے بدلے کے دن کے مالک، اے ہمارے معبود، اے ہماری جہولیوں کو بھرنے والے! مجھے سیدھا راستہ دکھا دے۔ اگر یہ سیدھے راستے پر نہیں، صراطِ مستقیم پر نہیں، اگر اسے ہدایت نہیں ملی تو کلمہ ایمان، وضو، مسجد میں حاضری، نماز ان سب کا کیا مطلب ہے اور اگر یہ سیدھے راستے پر ہے تو پھر ہدایت کیوں مانگ رہا ہے۔ جو چیز پہلے سے حاصل ہو اسے مانگنا بے عقلی ہے، نادانی ہے، یہ تو تحصیل حاصل ہے۔ تحصیل حاصل عربی ہے۔ یہ بحال بھی ہے۔ یہ بحال چیز کے لئے دعا کیوں مانگ رہا ہے اور پھر از خود نہیں مانگ رہا۔ رب کے کہنے پر مانگ رہا ہے اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ نماز کی حقیقت کیا ہے؟ نماز ہمیں کیوں تعلیم کی گئی ہے؟ قرآن مجید میں یہ ارشاد ہے کہ ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِعِبَادُونِي“ (آیت ۵۶) انسان کی تخلیق کا مقصد خدا کی عبادت ہے۔ خدا کی معرفت کا حصول ہے اور نماز جو انسان کی تمام عبادتوں کا خلاصہ ہے، اس کا اصل مقصد بھی یقیناً معرفت خداوندی ہے اور صراطِ مستقیم بھی وہی راستہ ہے جو ہمارے رب کی طرف جاتا ہے۔ جس پر چل کر ہم اپنے رب کی سے قریب ہو سکتے ہیں اور اپنے رب کی مغفرت حاصل کر سکتے ہیں اس راستے کی بے شمار منزلیں ہیں۔ بے شمار درجات ہیں۔ یہ راستہ تو خدا کی طرف جاتا ہے اور خدا الاحدود ہے۔ خدا ایسا نہیں، جیسے آپ کہیں گے کہ یہاں سے شروع ہو کر یہاں تک ختم ہو گیا ہے۔ نہیں وہ لامتناہی ہے۔ جب خدا الاحدود ہے تو جو راستہ اس کی طرف جا رہا ہے، وہ بھی الاحدود ہے اس کی بے شمار منازل اور بے شمار مراحل ہیں اس کے بے شمار درجات ہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ، سب سے پہلا مرتبہ سب سے پہلی منزل ”ایمان“ ہے۔ پھر اس پر چلتے چلے جاؤ، گناہوں سے بچنا، نیکیوں کو اختیار کرنا، روزہ رکھنا، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، فحش و فجور سے اجتناب کرنا، اس کے احکامات کی بجا آوری میں مشغول رہنا، اس کی مرضیات پر عمل کرنا، اس کی خوشنودی طلب کرنا، بے شمار مراحل، بے شمار درجے ہیں اس کی ذات لامتناہی ہے اس لئے اس کی معرفت کے درجات بھی لامتناہی ہیں۔ یہ صراطِ مستقیم ہمیں



اس کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ اب کس مقام کو کہیں گے کہ بس اب ہم خدا تک پہنچ گئے۔ اب اس کی معرفت اور قرب کے درجات ختم ہو گئے۔ نہیں، بندہ نماز میں کھڑا عرض کرتا ہے کہ اے میرے مالک! تو نے مجھے توفیق بخشی، تو نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا، میں تیری بارگاہ میں حاضر ہو گیا۔ میرے مولا! اب مجھے معرفت کا اگلا درجہ بھی عطا فرما دے۔ یہ درجہ مل گیا۔ مولا! اب دوسرا درجہ دکھا دے۔ تیسرے درجے تک پہنچا دے۔ اب جو اس سے اگلا درجہ تیری معرفت کا ہے، وہ مجھے عطا فرما دے۔ گویا ہر ایک ہدایت مانگنے والا، اپنے حال کی مناسبت سے، اپنی شان اور اپنے مقام کے مطابق مانگ رہا ہے۔ میں جو اس کا گناہ گار بندہ ہوں، میں اس سے ہدایت مانگوں گا، ”اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ کہوں گا تو وہ درجہ طلب کروں گا جو میرے حسب حال ہے اور اگر کوئی صالح، متقی، اللہ کا ولی ”اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ کہے گا تو وہ اپنے مرتبے کے مطابق خدا تعالیٰ سے اس کی معرفت کے اگلے درجے کو طلب کرے گا۔ کوئی صحابی کہے گا تو وہ اپنے مقام کے مطابق کہے گا۔ خلفائے راشدین کہیں گے، حسین کریمین کہیں گے، سیدۃ النساء فاطمہ الزہراء کہیں گی، ازواج مطہرات کہیں گی تو اپنے حال کے مطابق خدا تعالیٰ کی معرفت کے درجات کی طلب کا اظہار ہو گا اور سرکارِ دو عالم نور مجسم ﷺ معرفت کے جس درجے کو طلب فرمائیں گے، اس کا تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

☆ معلوم یہ ہوا کہ نماز ان تمام عبادات کی جامع ہے جو انسان کے لئے ہیں اور انسان تمام مخلوقات کا جامع ہے تو نماز نہ صرف تمام مخلوق کی عبادتوں کی جامع ہوئی بلکہ انسان کی اپنی دیگر تمام عبادات کی بھی جامع قرار پائی۔

WWW.KAZZMIS.COM